جلد ۱۰۸ فروری ۱۹۸۸ء عدد ۶

ماھنامہ

ترجمان القرآن

مؤسس

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی رحمہ اللہ تعالیٰ

ادارۂ ترجمان القرآن، اچھرہ، لاہور

فہرست مضامین

جلد ۱۰۸ | فروری ۱۹۸۸ء مطابق جمادی الآخریٰ ۱۴۰۸ھ | عدد ۶

ماہنامہ ترجمان القرآن لاہور

۵ - اے ذیلدار پارک ، اچھرہ ، لاہور

فون نمبر ——— ۳۲۴۴۶۸

زر سالانہ تیس روپے - فی پرچہ -/۳ روپے

سید حسین فاروق مودودی نے ایچ فاروق ایسوسی ایٹس لمیٹڈ لاہور سے چھپوا کر دفتر ترجمان القرآن اچھرہ لاہور سے شائع کیا۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اشارات

دعوتِ اسلامی اور غلبۂ شریعت کی برسوں لمبی جدوجہد کرتے کرتے اب یہ تلخ حقیقت خاص خاص افراد تک محدود نہیں رہی، بلکہ اسلامی رجحان کے ہر شخص اور جماعت کو محسوس ہونے لگی ہے کہ ہمارے راستے میں آہنی دیواریں حائل ہیں۔ مولانا مودودیؒ نے اس کا اشارہ کیا ہے۔ مارشل لا کے بعد بحالیٔ جمہوریت، انعقادِ انتخابات اور پارلیمانی کارروائیوں کا جائزہ لیتے ہوئے نہایت سادہ طبع لوگوں میں بھی یہ طرزِ فکر اُبھر آیا ہے اور بہت زیادہ مستحکم و مدلل ہو گیا ہے کہ ہم لوگ جاگیرداری، سرمایہ پرستی اور بیوروکریسی کے اہرام نما قفسِ مثلث میں اسیر ہیں اور یہ قفس سامراجیت کی شاخ پر ٹنگا ہوا ہے۔ یہ حالت جب سمجھ میں آجائے تو پھر یہ اندازہ کرنا بھی مشکل نہیں رہتا کہ آج تک اگر احیائے اسلام کے لیے کوئی اہم کام نہیں ہو سکا (پاکستان کا مطلب اجتماعی عملی زندگی کی لغت میں لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللہ نہیں مودار ہوا)۔ اُردو کو قومی زبان کی حیثیت نہیں مل سکی، وحدت و سالمیت پاکستان کے خلاف لسانی، علاقائی، نسلی اور فرقہ وارانہ عصبیتوں کے حملے روز بروز بڑھتے جا رہے ہیں تو یہ قدرتی نتیجہ ہے اُس صورتِ حالات کا جس میں ہم مبتلا ہیں۔ ظاہراً کوئی غلامی موجود نہیں ہے۔ مگر حقیقت میں ہم غلامی کی برف آمیز دلدل میں دھنسے ہوئے ہیں۔ ظاہراً کوئی زنجیریں لپٹی ہوئی نہیں ہیں، مگر نئی اَن ٹوٹ زنجیریں اس لحاظ سے خطرناک ہیں کہ یہ دکھائی نہیں دیتیں اور انہوں نے ہماری تعلیم، معیشت، سیاست، ادب اور ثقافت میں اپنی جڑیں گہری اُتار دی ہیں۔ یوں سمجھیے کہ ان جڑوں کے سرے ہمارے دل و دماغ کے خلیوں سے جا جُڑے ہیں۔

اِس نقشۂ احوال نے زندگی کے تمام شعبوں اور اداروں پر آسیبی سایہ ڈال دیا ہے۔

سُپر پاورز ــــ کوئی دوست بن کر اور کوئی مخالف بن کر عجیب پارٹ ادا کر رہی ہیں۔ پہلے دوست امریکہ کو لیجیے۔ اجمالاً آپ دیکھتے ہیں کہ ہمیں بار بار قرض لینا پڑتا ہے، دفاعی سامان مانگنا پڑتا ہے، وہاں ناک رگڑوائی جاتی ہے۔ اسرائیل اور بھارت کی پروپیگنڈا مشینری اور سفارتی نظام مل کر ہمیں اچھی طرح خراب کرتے ہیں۔ بلکہ خود امریکہ کی سفارتی اور پارلیمانی فضا یہ چاہتی ہے کہ پاکستان کے سرِ غرور داری میں کیلیں ٹھونکی جاتی رہیں۔ پھر کچھ ملتا ہے تو اس کے ساتھ "دوستی" شامل ہوجاتی ہے۔ مگر دوستی بنیئے کی دوستی ہے، وہ جو کچھ دیتا ہے اس سے زیادہ لے کر اور ہمیں جگہ جگہ استعمال کرکے بھی عزت کی نگاہ سے نہیں دیکھتا۔

وہ تھوڑا سا اسلحہ اور مالی امداد ہمیں دے کر پھر جلدی سے بھارت کو راضی کرنے چل پڑتا ہے اور اس کی جھولی ڈالروں اور اسلحہ سے خوب بھرتا ہے، بلکہ ساتھ ٹیکنالوجی بھی مہیا کرتا ہے۔ حتیٰ کہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہمیں جو کچھ دیا جاتا ہے وہ صرف اس لیے دیا جاتا ہے کہ بھارت پر جب اسلحہ اور ڈالر دل کھول کر نچھاور کیے جائیں تو کہیں پاکستان کو خطرہ محسوس نہ ہونے لگے اور یہ کارروائی مجری نہ لگے۔ یہ گویا پہلے سے منہ بند کرنے کی حکمتِ عملی ہے۔

گویا مستقبل کی کسی بڑی جنگ کی تیاری یوں ہو رہی ہے کہ بھارت کو روس بھی بہترین سازو سامان سے لیس کر رہا ہے اور امریکہ بھی اپنی اعلیٰ جنگی ایجادات فراہم کر رہا ہے۔ ساتھ ساتھ اسے بحری طاقت بھی بنایا جا رہا ہے۔ مقصد اتنا ہی نہیں کہ خوب سہارا دے کر بھارت کو ایک سپر پاور بنا دیا جائے اور جنوبی ایشیا میں اس سے پولیس کا کام لیا جائے۔ بلکہ آگے کا سوچا ہوا خفیہ منصوبہ یہ ہے کہ جب کبھی آئندہ بڑا معرکہ چھڑے تو امریکہ و روس اپنی اپنی جگہ اور اسلام اور مسلمانوں سے گہری نفرت رکھنے والا بھارت اپنی جانب سے علاقے کی اس خطرناک پٹی کا صفایا کردے جہاں بالفاظ دشمناں "بنیاد پرست" مسلمان جارحیت پسند اسلام کا علم اٹھا رہے ہیں ــــ یعنی پاکستان، افغانستان اور ایران کا علاقہ ــــ اور پھر آگے بڑھ کر اسرائیل کے

تعاون سے مشرقِ وسطیٰ اور افریقہ و ترکی کے مسلمانوں کی تباہی کا سامان کیا جائے۔ بیچ میں چین سے یا تو روس اور بھارت کی مصالحت ہو جائے یا اس کو بھی لپیٹ میں لے لیا جائے۔ اگرچہ جو لفظ "صفایا" لکھا گیا ہے اس کے معنی یہ نہیں کہ زمین کا یہ ٹکڑا ہی غائب ہو جائے بلکہ مراد یہ ہے کہ اس کی آبادی کو خوب کچلا جائے۔ اور ان میں اگر اسلامیت باقی رہے تو ایک بے جان لوتھڑے کی شکل میں رہے۔ بلکہ کسی کسی کے سینے میں آہِ نارسا بن کر۔

اِس خوف ناک امکانی تصور کو سامنے لاتے ہوئے میں ہرگز کسی خوف یا مایوسی میں مبتلا نہیں ہوں اور نہ کسی قاری کو ہونا چاہیے۔ کیونکہ دنیا میں دینِ حق اور علمبردارانِ دینِ حق کے وجود پر پانی پھیرنے کے لیے بارہا کئی انسان کُش اور تہذیب سوز سازشیں بنیں۔ مگر ہر سازش کی نہایت اہم ڈوریاں مشیّت نے یکایک کسی تاریخی حادثے کے ہتھیار سے کاٹ دیں۔ اگر یوں نہ ہوتا تو نہ اسلام نام کے دین کا نام و نشان کہیں ملتا اور نہ مسلمان نامی ملّت کا وجود ہوتا۔ (خدا آئندہ بھی بچائے)

فتنۂ تاتار، صلیبی جنگیں اور مغربی شہنشاہیت کی ظالمانہ تباہ کاریاں اگر دین و ملّت کو نہ مٹا سکیں تو آئندہ کون سی سازش اور کون سا ظلم خاتمہ کر سکتا ہے۔

اِس طرح کے امکانات کا سدِباب اور غیر مرئی زنجیروں میں جکڑے رہنے کی مصیبت سے نجات کا واحد راستہ سچے عقیدے اور روشن نصب العین کے سہارے اپنے پیروں پر کھڑے ہونا ہے۔ اگر ہم فیصلہ کر لیں کہ کسی سپر پاور کے مزارع بن کر ہم نہ رہیں گے۔ اور کسی ایک کی گود سے اٹھ کر کسی دوسرے کی گود میں نہ جا بیٹھیں گے (جب کہ بہت سے دانشور محض سرپرست اور گود کو تبدیل کرنے کا مشورہ دیتے ہیں) اور یہ فیصلہ کر لیں کہ قرضوں کے تمام بندھن کاٹ کر جئیں گے، خواہ اس کے لیے پیسہ پیسہ کر کے قوم سے چندہ لینا پڑے، خواہ وزیروں اور امیروں کو خاص طور پر فاقہ کشی کرنی پڑے، چاہے معیارِ زندگی کو گرانا پڑے —— اور یہ فیصلہ کر لیں کہ اپنی ضرورت کا اسلحہ (خاص طور پر انتہائی جدید دفاعی سامان) ہم کھلی مارکیٹ

سے یا خفیہ مارکیٹ سے مہنگے داموں خرید کر جن کام چلائیں گے، اور یہ فیصلہ کر لیں کہ قوم کے اندر جو وجوہِ انتشار اور وجوہِ بے اطمینانی کار فرما ہیں ان کا ازالہ کر دیں گے تو سامراجیت کی فکری، تہذیبی، اقتصادی اور دفاعی غلامی کا خاتمہ ہو سکتا ہے۔ مسلمانوں میں دفاع کی قوت بڑھانے کے لیے سچی خدا پرستی، قیامِ اسلام کے لیے جدوجہد، پاکیزہ اخلاق کی فضا اور محلہ بہ محلہ تنظیموں کے لیے نوجوانوں کو اعلیٰ مقصد پر لگانے اور فوجی اسپرٹ کے ساتھ متحرک رکھنے کی ضرورت ہے۔

مگر اس کے لیے جیسے لیڈر چاہئیں اور جیسی حکومت چاہیے، اس کے بغیر یہ خواب، خیالِ محال و جنوں ہے۔

ہمیں سپر پاورز کے چنگل سے نکلنے، اسلامی ریاست و معاشرہ قائم کرنے اور ظلم و استحصال کے کولہو میں پسنے والی اور جادہ ہائے معیشت میں چیونٹیوں کی طرح روندی جانے والی مخلوق کو بچانے کے لیے صداقت پسند، جرأت کیش، دیانت دار، پاک نگاہ، اور ایثار پیشہ لیڈروں کی ٹیم کی ضرورت ہے۔ مگر ایسی قیادت کے ظہور کا سدِباب کرنے کے لیے ہماری ممتاز استحصالی قوتوں نے گٹھ جوڑ کر کے ایسی سیاست، ایسی جماعت سازی، ایسے طریقِ انتخاب اور معیارِ انتخاب اور ایسے پارلیمانی طریقِ کار کو قوم کے سر ٹھونس رکھا ہے کہ اس "میجینو لائن" کے ہوتے ہوئے اس بات کا قطعاً امکان نہیں ہے کہ ایمان اور علم و کردار رکھنے والے معزز شہریوں کی ایک مؤثر ٹیم اقتدار کے محل میں جا داخل ہو۔ قدم قدم پر جو رکاوٹیں اس جادۂ سیاست و انتخاب میں ہیں، ان کے ہوتے ہوئے زیادہ سے زیادہ یہی ممکن ہے کہ اکا دکا اسلامی ذہن و کردار کے اچھے لوگ بھی میخانۂ جاہ میں جا داخل ہوں، یا پھر یہ کہ اگر کچھ قواعد شکنی کر کے، کچھ اپنی اخلاقی پابندیوں کو کم کر کے اور مفاد کے تالاب میں ڈبکیاں لگانے والے لوگوں میں سے کچھ کے ساتھ غلط سلط طریق سے (کچھ لو اور کچھ دو کے اصول پر) گٹھ جوڑ کر کے دس پانچ کی ٹولی اوپر جا پہنچے اور بعد ازاں کچھ اچھی آوازیں بلند کرنے کے ساتھ جبر کیش اکثریت کی اندھی، متعصبانہ اور

تمسخرانہ مخالفت کا نشانہ بنے۔

تاہم یہ کوشش بھی ایک اچھا پہلو رکھتی ہے، وہ یہ کہ قومی اور صوبائی ایوانوں سے اسلام کی آواز دنیا بھر میں سنائی دے سکتی ہے اور ملک کے عوام میں سے کچھ نہ کچھ تعداد کو اس کی طرف متوجہ کیا جاسکتا ہے۔ نیز موجودہ سیاسی اور پارلیمانی نظام کی ساخت میں اور اس کے شرکا میں جو کمزوریاں ہیں، ان کو واضح کیا جاسکتا ہے۔ جیسے کہ آج یہ حقیقت واشگاف ہوکر سامنے آگئی ہے کہ دینِ حق کو ماننے کے بعد ہمارے خداوندانِ سیاست کی روش کیا ہے۔ کتاب و سنّت کے ہوتے ہوئے ان کی مخالفت کا راستہ اختیار کرنا، اُن کے مقاصد کو تباہ کرنے والے اداروں اور ثقافت اور شعائر و اقدار کی ترویج کرنا، یا ان کی تعلیمات سے بے اعتنائی برتنا، یا ان کے واضح اور قطعی احکام کی مضحکہ خیز معنویتیں بیان کرنا، یا زمانے کی تبدیلی اور اجتہاد کے نام سے قرآن و حدیث کے الفاظ و معانی میں حیرت انگیز ردوبدل اور تحریف کرنا، یا بعض اوقات کسی فرد یا جماعت یا کسی واقعہ کو سامنے رکھ کر اس کی آڑ میں دین پر پھبتیاں کسنا، دلائل سے کام لینے کے بجائے خوب شور مچانا اور بالآخر محض ووٹوں کی عددیت کے بل پر حق اور باطل، جائز اور ناجائز، تخریب اور تعمیر، نفع اور نقصان، عدل اور بے انصافی کا تصفیہ قانون اور پالیسی کی شکل میں کردینا، یہ سب کچھ ہماری سیاست، جمہوریت یا حکمرانی کا نہایت غیرصحت مندانہ نقشہ ہے۔

زیادہ تکلیف دہ صورتِ حالات یہ ہے کہ اسلام کے نعرے اور قیامِ اسلام کے وعدے کو عوام کے دل بہلاوے کے لیے برسوں استعمال کرکے اسلام گریز قوتوں نے اسے قطعی طور پر غیرمؤثر بنادینے اور لوگوں کو خاصا مایوس کردینے کے بعد اب "اسلامی سیکولرازم" اور "سیکولر اسلام" کے ناقابلِ فہم تصور کو قوم پر ٹھونسنے کے لیے مختلف ہتھکنڈوں سے کام لینا شروع کردیا ہے۔ ایک طرف دانش وروں کی ٹیم، دوسری طرف ذرائع ابلاغ، تیسری طرف ماڈرن خواتین اور چوتھی طرف حکومت کی اسلام گریز پالیسیوں کو ہم چاروں طرف سے مصروفِ عمل دیکھتے ہیں، جن کی پشت پناہی سامراجی قوتیں اور تمام علم بردارانِ تہذیب الحاد اور جملہ دشمنانِ احیائے اسلام کر رہے ہیں۔ تازہ خبر یہ ہے کہ گوربا چوف رنگین کو اسلامی بنیاد پرستی (یا احیائے اسلام)،

کا سدِ باب کرنے کے لیے متوجہ کرنے والے ہیں۔ درآنحالیکہ امریکہ تو پہلے ہی کیمپ ڈیوڈ سمجھوتے کے ساتھ مصر میں "بنیاد پرستی" کو حکومت سے کچلوانے کا منصوبہ دے چکا ہے اور وہ اس وقت آؤٹ بھی ہو گیا تھا، اور اس پر عمل بھی ہوا۔ اسی طرح روس اپنے ہاں پہلے ہی کئی مسلم ریاستوں کو ختم کرنے کے ساتھ جبری الحاد کے ذریعے اسلام کو بھی کچل چکا ہے اور اب اس کی نوآبادیوں اور زیراثر ممالک میں اسلام دشمنی اور مسلم دشمنی کا عمل تیز تر ہو رہا ہے۔

سچی بات تو یہ ہے کہ یہ طرح طرح کے جو سیاسی ڈرامے ہم شروع سے دیکھتے آرہے ہیں، ان کا کوئی سین اکثریتی جبریت کے نام سے ہو، کسی شخصی آمریت یا کسی جتھے کے استبداد کا ہو، مارشل لا، یا جمہوریت بہ سایہ بند و بست جرنیلی ہو، یا جماعت سازی کے کسی مصنوعی کھوکھلے ڈھانچے کے سہارے اختلافی قوتوں اور اقلیتی اپوزیشن کی دھنائی کرنے کا دستوری و پارلیمانی اہتمام ہو، ان تمام صورتوں میں ہمارا اصل اور مستقل حکمران وہی "تگڈم" رہا ہے جو جاگیرداری، سرمایہ پرستی اور بیوروکریسی سے مل کر بنا ہے۔ اس تگڈم کو جب ضرورت ہوتی ہے تو یہ آمریت کا پیرایہ اختیار کر لیتا ہے، جب دوسری طرح کی ضرورت ہوتی ہے تو مارشل لا کا روپ دھار لیتا ہے۔ اور جب کبھی بہت مجبوری ہو تو جمہوریت کا کھیل شروع کر دیتا ہے۔ اس قوت کو پچھلے ادوار میں غنڈوں کی منتقل ٹولیوں کا، اور اب بعض صوبوں میں جرم کاروں کا تعاون حاصل ہے۔ نیز یہ قوت بڑے غیر محسوس طریقوں سے آزاد پریس کو بھی اپنی زلفوں میں اسیر رکھتی ہے۔ خود پریس پر ایسے لوگوں کا تسلط ہے جو اسلام گریز اور لادینیت پسند ہیں۔

جہاں تک اسلام کے راستے میں چٹانیں لالا کے ڈالنے اور خاردار تاریں لگانے کا معاملہ ہے تو اس خاص "نیک" کام میں ان کو کئی اطراف سے امداد ملتی ہے۔ اوّل تو سپر پاورز اور اہل مغرب کی طرف سے بلا شیری ہوتی ہے اور اظہارِ خوشنودی[1]، پھر تمام کمیونسٹ اور لادینیت پسند حضرات، اباحیت پسند گروہ، عیسائی دوست، قادیانی مہربان، جو اوّل روز

---

[1] یہاں اکبر الٰہ آبادی کا شعر یاد آتا ہے:

میرے اسلام کو اب قصۂ ماضی سمجھو
ہنس کے مس بولی تو پھر مجھ کو بھی راضی سمجھو

سے غیر پرستی، جاسوسی، سازش کاری اور تفرقہ انگیزی کے ماہر ہیں۔ اور اب تخریب کارانہ حرکتوں میں اسرائیلیوں کے بھی کان کترتے ہیں) اور ملک کی مسلمان اکثریت سے بنیادی اختلاف رکھنے والے کٹر اور متعصب فرقے سب اسلام دشمنی کے ایک ہی حمام میں بے لباس ہیں۔[1]

اسلام تو رہا ایک طرف، یہاں نو زائدہ پاکستانی مسلم قومیت نہ پنپ سکی، اُردو کو چالیس سال میں اس کا مقام نہ مل سکا، نہ عوام کا معاشی مسئلہ دسویں حصے تک بھی حل ہو سکا جسے بعض لوگ قائداعظم اور علامہ اقبال کے حوالے سے اصل مقصدِ پاکستان قرار دیتے ہیں اور اسی مقصد کو اسلامی نظریہ و تحریک کے توڑ کے لیے استعمال کرتے ہیں۔ حالانکہ معاشی ترقی اور اسلامی احیا دونوں ساتھ ساتھ ہونے چاہئیں۔ اسی طرح یہ بھی نہ ہو سکا کہ بڑے معاندین کی زد میں رہنے والی یہ قوم اپنے تحفظ، اسلام کے عروج اور پاکستان کے استحکام کے لیے ایک مجاہد قوم بن گئی ہوتی، جس کا بچہ بچہ جذبۂ جہاد سے سرشار ہوتا اور جس کے جوان تعلیم گاہوں میں اور محلوں میں منظم ہو کر دفاعی تربیت حاصل کرتے۔ نہ ایسا ہی ہو سکا کہ ہم اپنی قوت میں سائنسی تحقیقاتوں کے ذریعے نت نیا اضافہ کرتے۔ فزیکل، فزیالوجیکل کیمیکل انجینئرنگ کے دائروں میں نئے نئے انکشافات و اکتشافات اور ایجادات سے ہم دائرہ امن کے لیے بھی اور دائرہ جنگ کے لیے بھی ایسی قوتیں فراہم کرتے جن تک ابھی دوسروں

---

[1] ہمارے کارپردازوں نے اضافہ آبادی کی سیاسی معنویت کو نظرانداز کر کے تلقینِ مغرب (اور مالی امداد) کے تحت خاندانی منصوبہ بندی کی جو اسکیم شروع کر رکھی ہے، اس کا اثر یہ نمودار ہو رہا ہے کہ اسلام دشمن قوتوں میں تو نسلی بڑھوتری تیزی سے ہو رہی ہے اور سارا نزلہ مسلم اکثریت پر گر رہا ہے۔ آخر نتیجہ یہ ہو گا کہ مسلمان پاکستان میں اقلیت بن جائیں گے۔ حضراتِ اکابر کبھی خفیہ طور پر مختلف گروہوں کی رفتارِ اضافہ کا ریکارڈ مرتب کر کے دیکھیں۔

کی رسائی ہو ہی نہیں پائی۔

مگر بدقسمتی سے معاشی اور مادی قوت کا پہیہ بھی اُلٹا گھومتا رہا۔

صنعت کا حال پرائیویٹ سیکٹر میں یہ ہے کہ بڑے بڑے کارخانوں کے سرمایے ختم ہو چکے ہیں اور خسارہ در خسارہ کے سلسلے کو پورا کرنے کے لیے بنکوں کے سرمایے کام کر رہے ہیں۔ پبلک سیکٹر کی اکثر صنعتیں خساروں اور مقروضیت کے روگوں میں مبتلا ہیں۔ اور پھر صنعتوں کو خیانت کے منہ میں بھی سونے کے لقمے ڈالنے ہوتے ہیں۔

نئی صنعتیں کھولنا اس لیے مشکل ہے کہ اتنے قانونی تقاضے، دفتروں کے چکر، رشوتوں کے مطالبے اور سر پر لٹکتی ہوئی ٹیکسوں کی تلواریں، صنعتی خام مال کے سلسلے میں بعض درآمدوں کی مشکلات، پھر بیرونی مصنوعات کی اعلیٰ معیاریت اور قیمت کی ارزانی کا مقابلہ، پھر باڑہ مارکیٹوں کی قانونی اسمگلنگ کا مقابلہ، پھر جاپان اور چین کی مہروں کے ساتھ کوریا، ہانگ کانگ سنگاپور اور خود پاکستان میں بنی ہوئی جعلی چیزوں (خصوصاً موٹر سپیئر پارٹس) وغیرہ کا دباؤ۔ اِن حالات کے گھیرے میں کوئی نوخیز صنعت کس طرح سر اُٹھا سکتی ہے۔ کئی صنعتیں شروع ہو کر ختم ہو گئیں۔

دوسری طرف بنکوں کی پُرکشش اسکیموں، طرح طرح کے انعامی بانڈز، سرٹیفکیٹوں اور مختلف فنانشل منصوبوں، تعمیراتی پروگراموں، قسطوں کے کاروبار وغیرہ نے باہر سے آنے والے سرمایوں کو اپنی طرف کھینچنے کے لیے پوری اشتہاری قوت لگا دی ہے۔

کوئی اللہ کا بندہ ایسا نہیں اُٹھتا جو اقتدار کی قوت سے آراستہ ہو کر اس ساری صورتِ حالات کا بے لاگ جائزہ لے کر اصلاحِ احوال اور تعمیرِ معیشت کی اسکیموں کو روبعمل لاتے۔

زراعت کا قصہ بھی عبرت آفرین ہے۔ بیج باہر سے، مشینیں اور آلات باہر سے، کیڑے مار دوائیں باہر سے، پانی کے کھالے بنانے کے لیے رقمیں بیرونی ترسنوں کی، اُوپر سے قدرت کی ناراضی کا یہ عالم کہ دو سال سے موسموں کا نظام تلپٹ، وقت پر بارشیں غائب، بے وقت جل تھل کا عالم، اب ضروری غذائی اجناس کی درآمد اور زرعی برآمدات میں کمی دربپیش ہے۔

مجموعی معاشی حالات کو اگر آپ اعداد و شمار کے ڈائل پر غور سے ملاحظہ کریں تو اوّل تو یہ

دیکھیے کہ آپ کے سکے کی قیمت میں کتنی کمی آچکی ہے۔ افراطِ زر کی پرواز کہاں تک جا پہنچی ہے اور گرانی کا پیمانہ کیا ہو گیا ہے۔ پھر دیکھیے کہ بجٹ میں خسارہ ہے، تجارتِ خارجہ میں بھاری خسارہ ہے، سرکاری ریزرو فنڈ اور زرِ مبادلہ میں گھاٹا ہے، حتیٰ کہ اب دفاع میں بھی ۱۲ ارب روپے کے مصارف کم کرنے سے معاشی بدحالی کا بدنما چہرہ اور زیادہ بے نقاب کر دیا گیا ہے۔

لیکن اربابِ اقتدار جس طرح پہلے لکھے لُٹ ہوا کرتے تھے، اسی طرح اب بھی ہیں۔ بلکہ اب پارلیمانی ارکان کے ذریعے قومی دولت کا ایک بڑا حصہ ایسے طریق سے خرچ کروایا جاتا ہے کہ آگے کے انتخابات میں بھی برگ و بار دے سکے۔

سرکاری اقامت گاہوں، ان کے فرنیچر اور قالینوں، گاڑیوں اور ٹیلی فونوں اور دوسرے وسائل (حتیٰ کہ اسٹیشنری تک) کا ناجائز استعمال اور سرکاری ملازمین سے گھریلو خدمات لینے کا رواج، سفروں کے اخراجات، بیرونِ ملک سفر کرنے اور اپنے لیے اور اپنے اقرباء کے لیے غیر ملکی مہنگے علاج کرانے وغیرہ کے معاملات ایسے ہیں کہ ہمارے غریب ملک کو پنپنے نہیں دیتے۔

غالباً ہمارے اکابر کے سیاسی ہدایت نامے میں یہ سبق بھی لکھا ہوا ہے کہ غریب عوام کو جتنا زیادہ مبتلائے مصیبت رکھو گے اتنا ہی اچھا دور گزار سکو گے۔ چنانچہ لوگوں کا حال یہ ہے کہ جس طرح جامن بیچنے والا چھلنی کے طرح چھیدے ہوئے ٹین کے ایک ڈبے میں جامنوں کے ساتھ نمک مرچ ڈال کر مسلسل جھٹکے دیتا ہے، بالکل اسی طرح ہمارے عوام جامن بنے ہوئے زخم بھی کھاتے ہیں اور نمک بھی لگواتے ہیں۔

قرضوں کا حال یہ ہے کہ اب ہم اربوں کے جال میں پھنسے ہوئے ہیں۔ اور اس جال کے حلقوں میں برابر اضافہ ہو رہا ہے۔ ہماری کوئی اسکیم بیرونی قرض کے بغیر چل نہیں سکتی۔ اور ہمارے سارے دفاع کی رگ گلو انہیں قرضوں کے چنگل میں ہے۔ عالمی مہاجن ہماری رگِ گلو کی رسّی کھینچیں تو سانس لینا مشکل ہو جائے۔ اور ڈھیلی چھوڑ دیں تو پھر قومی قرض کا استعمال ایسے ایسے خیانت کارانہ طریقوں سے افراد کے مفاد کی خدمت کے لیے ہونے لگے کہ پوری قومی معیشت تہس نہس ہو جائے۔ ان قرضوں کے بل پر کوئی ترقی حقیقی معنوں میں کبھی نمودار نہیں ہوئی، بلکہ ہمارے نظام

میں روز بروز رخنے پڑتے چلے گئے۔ ہماری امنگوں کے محل کو دیمک چاٹ رہی ہے۔ ہماری تمام اسکیمیں اور قرضے ہمارے اپنے اختیار میں نہیں ہیں، بلکہ ان کا دار و مدار دوسروں کی نوازشوں پر ہے۔ ہمارے کارپرداز ہمیں بے بس کرنے کے لیے شاید قرضوں کی زنجیروں میں ہمیں جکڑوانا پسند کرتے ہیں۔

متذکرہ خرابی احوال پر قابو پاسکنے والی مؤثر قوتیں تمام کی تمام معیارِ زندگی کی سڑک پر دولت شہرت اور عزت کی ہر آن تیز ہوتی ہوئی دوڑ میں لگی ہیں۔ اور ان کی دیکھا دیکھی درمیانہ طبقے کے لوگ بھی اور ان کے پیچھے عوام بھی ـــــ مرد اور عورتیں ـــــ سب اس مجنونانہ دوڑ میں لگے ہوئے ہیں۔ معیار زندگی جتنا جتنا بڑھتا ہے، زندگی اتنی اتنی گھٹتی ہے، دولت جس رفتار سے زیادہ ہوتی ہے، ایمانوں کا افلاس بھی اسی رفتار سے زیادہ ہوتا ہے۔ شہرت اور نام نہاد عزت کے مقابلے میں جتنی بلندی حاصل کی جاتی ہے، انسانیت میں اتنی ہی پستی آجاتی ہے۔

کہیں یہ دوڑ کمانے اور کمائی کو بڑھانے کی ہے، کہیں یہ شو بزنس میں ابھرنے کی ہے، کہیں تعلیمی میدان میں آگے نکلنے کی ہے۔ کہیں آزادیٔ نسواں کی شکل میں ہے اور نت نئے فیشنوں اور اسبابِ آرائش کی دوڑ لگی ہوئی ہے۔ کہیں اخبارات میں بڑی بڑی ہوس انگیز رنگین تصویروں اور اداکاروں اور موسیقاروں کی نجی زندگی کی خبریات کی اشاعت کا مقابلہ ہے، کہیں ثقافت اور مینا بازاروں اور فینسی ڈریس شو کے تماشے ہیں۔

کمال یہ ہے کہ اس دوڑ میں آگے نکلنے والے پیچھے والوں کو سہارا نہیں دیتے، بلکہ دوسروں کے لیے (خصوصاً نیچے کے کمزور طبقوں کے لیے) راستہ بند کرنے جانتے ہیں۔ مثلاً کسی ۵۰ سال پہلے کے غریب خاندان کے بچے کی طرح اب یہ ممکن نہیں کہ ایک لڑکا محنت کے زور سے امتحانات پاس کرکے امرا کی اولادوں کو پیچھے چھوڑ دے۔ اب غریب نوخیز طالب علم کے لیے تعلیم الگ ہے، اعلیٰ مراتب کو سنبھالنے والے طبقوں کے بچوں کے لیے الگ۔ کسی غریب بچے کے لیے ممکن نہیں کہ مختلف قسم کی رکاوٹیں عبور کرکے اچھے جادہ تعلیم پر پڑ سکے۔ غریب

کا بچہ اگر تعلیم پا جائے تو کسی عہدے پر تو کیا سوال، کسی اچھی ملازمت کے حصول کی کشمکش میں بھی وہ آگے نہیں بڑھ سکتا۔ اسی طرح ایک طرف وہ لوگ ہیں جو دائمی طور پر ملک کے ذرائع و وسائل کے اجارہ دار بنتے جا رہے ہیں۔ اور دوسری طرف وہ ہیں جو مستقلاً ان کی غلامی پر مجبور ہیں۔ اوّل الذکر کی تعداد کم ہوتی جاتی ہے اور مؤخر الذکر بڑھ رہی ہے۔ دونوں کا فرق بڑھتے بڑھتے کچھ عرصے تک وہاں تک جا پہنچے گا کہ نچلا کثیر التعداد طبقہ شودروں کی طرح بیگار کرتا رہے گا۔ اور بھوکوں مرے گا۔

اس دوڑ میں خیانت بھی آ دخل دیتی ہے۔ وہ ہر آگے بڑھنے والے سے، بلکہ کسی بھی کمزور ترین اقدام کرنے والے سے اس کے ایک ایک قدم پر ٹیکس وصول کرتی ہے۔ یہاں بھی مقابلہ درپیش ہے جو جتنا زیادہ دے سکے، اتنا ہی فائدہ اُٹھالے۔

کتنے ہی بڑے بڑے سرکاری اداروں اور صنعتی کاروباروں اور قومی فنڈز میں غبن اور خیانت کے واقعات اخبارات میں آچکے ہیں۔

علاوہ ازیں زمین کا انتقال کرانا، رجسٹری کرانا، بجلی یا سوئی گیس کا میٹر حاصل کرنا، ٹیلی فون لگوانا، رسالے کا ڈیکلریشن حاصل کرنا، پاسپورٹ لینا، گاڑی یا اسلحہ کا لائسنس، ڈومیسائل سرٹیفکیٹ، آئیڈینٹی کارڈ یا ویزا لینا، ریڑھی چلانا، کھوکھا نصب کرنا، خوانچہ لگانا ہر مسئلہ جو پیش آئے گا۔ اس کے لیے کہیں نہ کہیں، کچھ نہ کچھ نذرانہ دینا پڑے گا۔

بات بات پر دفتروں کے چکر کھا کر، تھانوں اور عدالتوں کے رگڑوں سے گزر کر ناکام ہونے والے مصیبت زدہ لوگ جب جینے سے بیزار ہو جاتے ہیں تو ان کے لیے ہفتے دس دن کے میچوں کا ایسا انتظام کیا جاتا ہے کہ تمام کام بند رہتے ہیں۔ ان کے لیے ناچ مجروں کے انتظامات ہوتے ہیں۔ سودی فائدوں اور جوئے کی دلفریبیوں کے نئے نئے تجربے سامنے لائے جاتے ہیں۔ گندی ثقافت کے نقش جلوے ان کے سامنے بکھیرے جاتے ہیں تاکہ تفریح کی مستی میں اخلاق بھی خراب ہوں اور اسلام سے دُوری بھی بڑھے۔ اور زندگی سے مقصدیت کی رُوح بالکل ختم ہو جائے۔

یہی عوام ہیں جن کے نام پر سارا نظامِ جمہوریت چلتا ہے اور تمام اکابر اپنے آپ کو

انہی کا خادم قرار دیتے ہیں۔
اوپر سے اب تک جس ہمہ گیر طلسم کا نقشہ ہم نے کھینچا ہے اس نے نہ صرف تمام اسلامی قدریں بلکہ انسانیت کی خوبیاں بھی پیس کر رکھ دی ہیں۔ حلال و حرام کا قصہ ختم۔ ذکرِ خدا نہیں، شکرِ خدا نہیں خوفِ خدا نہیں، محبتِ رسولؐ نہیں، محاسبۂ آخرت کا تصور نہیں۔ البتہ کچھ نمائشی رونق میلے مذہب کے نام پر بھی زور شور سے ہوتے رہتے ہیں۔
بڑے لوگ سب کے سب گوشت پوست کے بنے ہوئے روبوٹ بنتے جارہے ہیں، جن کا ہنسنا، رونا، بولنا، اعلان کرنا، وعدے کرنا، ملنا جلنا سب کچھ اخلاص سے خالی مشینی عمل ہے۔
دراصل یہی وہ عناصر ہیں جنہوں نے قوم کی قوم کو غلامی در غلامی میں جکڑ دیا ہے۔ اور بچے بچے کا بال بیرونی قرضوں میں باندھ کر ہر کسی کو بے دست و پا کر دیا ہے۔
انگریزی ہم پر جبراً ٹھونسی جارہی ہے۔ سیکولرازم ہم پر مسلط کیا جارہا ہے۔ عیاشی اور فحاشی کو خوب فروغ دیا جارہا ہے، اسلام سے ہم کو دُور دھکیلا جارہا ہے، تعلیمی اداروں کی فضا کو دھواں دھار بنایا جارہا ہے۔ اور ہم کچھ نہیں کرسکتے۔ ان مسائل سے سیاسی جماعتیں بے تعلق ہیں، لیڈروں کو ہماری اس مصیبت کا علم نہیں، دانشوروں کی ادھر توجہ نہیں، ذرائع ابلاغ بے نیاز ہیں، بلکہ وہ خود اخلاقی و تہذیبی سیلابِ ہلاکت کو اُوپر لانے میں مددگار ہیں۔
دریں احوال اصل مسئلہ یہ ہے کہ اسلام اور انسانیت کو اپنے روڈ رولر کے نیچے پیسنے والی اِن قوتوں سے کیسے نجات ملے۔

میں یوں سمجھتا ہوں کہ ہم اگرچہ ایک قفس میں بند ہیں اور اس کے گرد خاردار تاروں کی ایک گرل سی بنی ہوئی ہے اور یہ قفس غلامانہ ذہنیت رکھنے والے عناصر کے ذوقِ غلامی کی زنجیر میں لپٹا ایک سپرپاور کی شاخ سے اچھی طرح بندھا ہے اور اِس زنجیر کا ایک چھوٹا سا حصّہ دوسری سپرپاور کی شاخ سے بھی اُلجھا ہوا ہے۔
مگر اس کے باوجود ساحرانہ اور ظالمانہ حالات کے خلاف کسی بھی وقت ایک ایسی انقلابی رَو اُٹھ سکتی ہے کہ جادو کا یہ سارا طلسم ٹوٹ جائے اور ہم ایک خوددار اور بیدار دل ملتِ اسلامیہ

کی حیثیت سے یہ اعلان کرتے ہوئے نمودار ہوں کہ ہم مسلمان ہیں اور اسلام ہمارا نظام اور ہماری تہذیب ہے، جس کے نقطے نقطے، شوشے شوشے کو ہم زندہ کریں گے۔ اور ہمیں ملّا اور رجعت پسند کہہ کر کوئی قوت مخالف اسلام سپر پاورز کے قدموں سے روندوا نہیں سکتی جو "بنیاد پرستی" کے عنوان سے ہمارے خلاف ایک طوفانِ نفرت و مخالفت برپا کیے ہوئے ہے۔

اگر یہ حیرت ناک بات ممکن ہے کہ علوم و وسائل کی انتہائی پسماندگی اور قلتِ تعداد کے باوجود افغانیوں نے رُوس کی ہولناک قوت کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا ہے، اگر یہ ممکن ہے کہ عین ماسکو میں نہ بہ نہ جبریت کے باوجود دو آدمی افغانیوں پر رُوسی مظالم کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرتے ہیں، اگر یہ ممکن ہے کہ اسرائیل ہی کے اندر سے ایک طاقت اس کی مسلم کُش ظالمانہ پالیسیوں کے خلاف علی الاعلان باغی ہو جاتی ہے تو پاکستان کا تو معاملہ ہی دوسرا ہے۔ یہاں تو لوگوں کو کتنا بھی بگاڑا جائے، یہ لوگ قرآن و حدیث کے اسلام کو ترک کر کے لادینیت کو اصولی اور سیاسی و قانونی طور پر اختیار نہیں کر سکتے۔ دس بار مغالطے کھا کر بھی وہ آخر میں اطمینان صرف اس وقت حاصل کر سکیں گے جب وہ دیکھ لیں گے کہ پاکستان کا مطلب عملاً لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہ ہو گیا ہے۔

اب ساری ذمہ داری ایسے لوگوں کے سر عاید ہوتی ہے جو سچے دل سے غلبۂ اسلام چاہتے ہیں۔ اس کام کے لیے موجودہ مزاحم عوامل کو راستے سے ہٹا دینا ضروری سمجھتے ہیں۔ ایسے حضرات پر یہ واضح ہے کہ ایسی بڑی تبدیلی بغیر اس کے نہیں آسکتی کہ کسی نظریۂ اساسی اور طریقِ انقلاب اور نظامِ مطلوب اور تغیراتِ لازم کے متعلق آبادی کی ایک معتدبہ ذی شعور تعداد بات کو اچھی طرح سمجھ نہ لے۔ ٹارگٹ کم سے کم یہ ہونا چاہیے کہ سال دو سال میں ایک کروڑ افراد تحریکِ اسلامی کی ضروریات کے مطابق مطلوبہ معیار تک پہنچ جائیں۔

ایسا ہوا تو قفسِ متشدث بھی ٹوٹ جائے گا، خاردار تاروں کی گرل بھی ٹکڑے ٹکڑے ہو جائے گی، زنجیریں بھی پگھل جائیں گی اور پنجرے کی تیلیوں کے جوڑ بھی کھل جائیں گے۔

ورنہ مخالف قوتیں مزاحمت کی دیواروں کو اور زیادہ اونچا، اور زیادہ دبیز کر لیں گی!

حکمتِ سیّد مودودیؒ

اسلامی قانون میں سزائے رجم

(ادارہ)

یہ امر کہ زنا بعدِ احصان کی سزا کیا ہے۔ قرآن مجید نہیں بتاتا، بلکہ اس کا علم ہمیں حدیث سے حاصل ہوتا ہے۔ بکثرت معتبر روایات سے ثابت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے نہ صرف قولاً اس کی سزا رجم (سنگساری) بیان فرمائی ہے، بلکہ عملاً آپ نے متعدد مقدمات میں یہی سزا نافذ بھی کی ہے۔ پھر آپ کے بعد چاروں خلفائے راشدین نے اپنے اپنے دَور میں یہی سزا نافذ کی اور اسی کے قانونی سزا ہونے کا بار بار اعلان کیا۔ صحابہ کرام اور تابعین میں یہ مسئلہ بالکل متفق علیہ تھا۔ کسی ایک شخص کا بھی کوئی قول ایسا موجود نہیں ہے جس سے یہ نتیجہ نکالا جا سکے کہ قرنِ اول میں کسی کو اس کے ایک ثابت شدہ حکم شرعی ہونے میں کوئی شک تھا۔ ان کے بعد تمام زمانوں اور مُلکوں کے فقہائے اسلام اس بات پر متفق رہے ہیں کہ یہ ایک سنّت ثابتہ ہے، کیونکہ اس کی صحت کے اتنے متواتر اور قوی ثبوت موجود ہیں جن کے ہوتے کوئی صاحبِ علم اس سے انکار نہیں کر سکتا۔ اُمت کی پوری تاریخ میں بجز خوارج اور بعض معتزلہ کے کسی نے بھی اس سے انکار نہیں کیا ہے اور ان کے انکار کی بنیاد بھی یہ نہیں تھی کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے اس حکم کے ثبوت میں وہ کسی کمزوری کی نشان دہی کر سکے ہوں، بلکہ وہ اسے قرآن کے خلاف قرار دیتے تھے۔ حالانکہ یہ ان کے اپنے فہمِ قرآن کا قصور تھا۔ وہ کہتے تھے کہ قرآن اَلزَّانِیْ وَ الزَّانِیَۃُ کے متعلق الفاظ استعمال کر کے اس کی سزا سو کوڑے بیان کرتا ہے۔ لہٰذا قرآن کی رُو سے ہر قسم کے زانی اور زانیہ کی سزا یہی ہے اور اس سے زانیِ مُحصَن کو الگ کر کے اس کی کوئی اور سزا تجویز کرنا قانونِ خداوندی کی خلاف ورزی ہے۔ مگر انہوں نے یہ نہیں سوچا کہ قرآن کے الفاظ جو قانونی وزن رکھتے ہیں، وہی قانونی وزن اس تشریح کا بھی ہے جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے کی ہو، بشرطیکہ وہ آپ سے ثابت

ہو۔ قرآن نے ایسے ہی مطلق الفاظ میں اَلسَّارِقُ وَالسَّارِقَۃُ کا حکم بھی قطعِ ید بیان کیا ہے۔ اس حکم کو اگر ان تشریحات سے مقید نہ کیا جائے جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہیں تو اس کے الفاظ کی عمومیت کا تقاضا یہ ہے کہ آپ ایک سوئی یا ایک بیر کی چوری پر بھی آدمی کو سارق قرار دیں۔ اور پھر پکڑ کر اس کا ہاتھ شانے کے پاس سے کاٹ دیں۔ دوسری طرف لاکھوں روپے کی چوری کرنے والا بھی اگر گرفتار ہوتے ہی کہہ دے کہ میں نے اپنے نفس کی اصلاح کر لی ہے اور اب میں چوری سے توبہ کرتا ہوں تو آپ کو اسے چھوڑ دینا چاہیے۔ کیوں کہ قرآن کہتا ہے: فَمَنْ تَابَ مِنْ بَعْدِ ظُلْمِہٖ وَاَصْلَحَ فَاِنَّ اللّٰہَ یَتُوْبُ عَلَیْہِ (المائدہ - ۳۹)۔ اسی طرح قرآن صرف رضاعی ماں اور رضاعی بہن کی حرمت بیان کرتا ہے۔ رضاعی بیٹی کی حرمت اس استدلال کی رو سے قرآن کے خلاف ہونی چاہیے۔ قرآن صرف دو بہنوں کے جمع کرنے سے منع کرتا ہے۔ خالہ اور بھانجی اور پھوپھی اور بھتیجی کے جمع ہونے کو جو شخص حرام کہے اس پر قرآن کے خلاف حکم لگانے کا الزام عاید ہونا چاہیے۔ قرآن صرف اُس حالت میں سوتیلی بیٹی کو حرام کرتا ہے جب کہ اُس نے سوتیلے باپ کے گھر میں پرورش پائی ہو۔ مطلقاً اس کی حرمت خلاف قرآن پانی چاہیے۔ قرآن صرف اُس وقت رہن کی اجازت دیتا ہے جب کہ آدمی سفر میں ہو اور قرض کی دستاویز لکھنے والا کاتب میسر نہ آئے۔ حضر میں، اور کاتب کے قابلِ حصول ہونے کی صورت میں رہن کا جواز قرآن کے خلاف ہونا چاہیے۔ قرآن عام لفظوں میں حکم دیتا ہے وَاَشْہِدُوْٓا اِذَا تَبَایَعْتُمْ (گواہ بنا لو جب کہ آپس میں خرید و فروخت کرو)۔ اب وہ تمام خرید و فروخت ناجائز ہونی چاہیے جو رات دن ہماری دکانوں پر گواہی کے بغیر ہو رہی ہے۔ یہ صرف چند مثالیں ہیں جن پر ایک نگاہ ڈال لینے سے ہی ان لوگوں کے استدلال کی غلطی معلوم ہو جاتی ہے جو رجم کے حکم کو خلافِ قرآن کہتے ہیں۔ نظامِ شریعت میں نبی کا یہ منصب ناقابلِ انکار ہے کہ وہ خدا کا حکم پہنچانے کے بعد ہمیں بتائے کہ اس حکم کا منشا کیا ہے، اس پر عمل کرنے کا طریقہ کیا ہے، کن معاملات پر اس کا اطلاق ہوگا اور کن معاملات کے لیے دوسرا حکم ہے۔ اس منصب کا انکار صرف اُصولِ دین ہی کے خلاف نہیں، بلکہ اس سے اتنی عملی قباحتیں لازم آتی ہیں کہ اُن کا شمار نہیں ہو سکتا۔

تحریکِ جہادِ اسلامی

مقبوضہ فلسطین میں۔ اندر اٹھنے والی نئی لہر

جناب خلیل حامدی صاحب

اِس وقت پورے مقبوضہ فلسطین میں آزادی کی لہر اُٹھ کھڑی ہوئی ہے۔ اِس لہر کو اُٹھانے میں اُن مظلوم فلسطینی نوجوانوں کے جذبۂ ایمانی کو دخل ہے، جو اسرائیل کے اندر ہی پیدا ہوئے ہیں۔ اور اسرائیل کی دہشت انگیز فضا میں پروان چڑھے ہیں۔ یہ نوجوان جذبۂ ایمان سے لبریز ہیں۔ ظلم و ستم کی چکی میں پستے رہے ہیں اور اب انہوں نے یہ طے کر لیا ہے کہ اسلام کے سائے میں آزاد زندگی گزاریں گے یا وہ جامِ شہادت نوش کر کے آنے والی نسلوں کے لیے غیرت و حمیت اور شجاعت و مردانگی کا نیا باب رقم کر دیں گے۔ ان نوجوانوں کی تنظیم کا نام "تحریکِ جہادِ اسلامی" ہے۔ اِس نے اپنے لیے جو شعار تجویز کیا ہے وہ تین باتوں پر مشتمل ہے۔

الاسلام مصدر قوّتنا (اسلام ہماری طاقت کا منبع ہے)۔

الاسلام رمز عزّتنا (اسلام ہماری عزّت کا عنوان ہے)۔

الاسلام طریق انتصارنا (اسلام ہماری کامیابی کا راستہ ہے)۔

ان نوجوانوں کی نمایاں اور قابلِ ذکر بات یہ ہے کہ عہدِ حاضر کے مسلمان مفکرین کے خیالات ان پر اثر انداز ہو گئے ہیں۔ اور وہ اسلام کو محدود معنی میں لینے کے بجائے ایک انقلاب پسند اور آزادی کے علمبردار دین کی حیثیت سے لیتے ہیں۔ نوجوانوں کے اسی گروہ کے بارے میں فرانس کے اخبار لوموند نے ۷ نومبر ۱۹۸۷ء کی اشاعت میں غزہ میں اپنے نمائندے کے

حوالے سے لکھا ہے:

"اب کسی شخص کو یہ شک نہیں رہا ہے کہ غزہ کے علاقے میں اسلامی لہر مسلسل اُبھرتی جارہی ہے۔ غزہ مقبوضہ فلسطین میں سب سے زیادہ غریب علاقہ ہے اور اب اسرائیلی حکام کے لیے یہ ممکن نہیں رہا کہ وہ اس اُبھرنے والی اسلامی لہر کے بارے میں اپنی بے چینی کو زیادہ دیر تک پوشیدہ رکھ سکیں گے"۔

فرانسیسی اخبار نے اسرائیلیوں کی جس بے چینی اور سراسیمگی کی طرف اشارہ کیا ہے، اُس کی توثیق اسرائیل کے وزیراعظم شمعون پیریز کے یہ الفاظ کرتے ہیں کہ:

"غزہ کے علاقے میں رہنے والے ۶ لاکھ فلسطینی اسرائیل کے لیے غزہ کے تین سو مربع کلومیٹر کے رقبے سے زیادہ خطرناک ہیں"۔

تحریک جہاد اسلامی کا مرکز غزہ میں ہے۔ غزہ کی اسلامی یونیورسٹی جسے اسرائیلی حکام بار بار بند کرنے کی سازش کرتے رہے ہیں تحریک جہاد کا نرسری فارم بن رہی ہے۔ اسرائیلی پارلیمنٹ (جسے یہودیوں کی اصطلاح میں کنسٹ کہا جاتا ہے) کے ایک رکن بنیامین بن بجازر نے اپنے بیان میں تسلیم کیا ہے کہ یہ تحریک پہلی مرتبہ ۱۵ اکتوبر ۱۹۸۷ء کو اس وقت منصۂ ظہور پر آئی جب بیت المقدس میں دیوارِ گریہ کے پاس جمع ہونے والے یہودیوں نے فیصلہ کیا کہ وہ ہر قیمت پر ہیکل سلیمانی کو بحال کریں گے۔ دوسرے لفظوں میں اس کے معنی یہ ہیں کہ وہ مسجد اقصیٰ کو مسمار کر دینے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ اس فیصلے کے بعد یہودیوں نے کوشش کی کہ وہ اجتماعی شکل میں مسجد اقصیٰ میں داخل ہوں اور ہیکل سلیمانی کی تجدید کا اعلان کریں۔ جہاد اسلامی کے کارکنوں نے یہودیوں کی اس سازش کو ہر قیمت پر روکنا چاہا۔ اس موقع پر مجاہدین اور یہودی فورسز کے مابین جھڑپیں ہوگئیں۔ اور نتیجۃً ۱۳ یہودی زخمی ہوئے اور ان میں دو مر گئے۔ تحریک جہاد اسلامی کی ماتحت تنظیم: "الاقصیٰ فورس" نے اس کارروائی کی ذمہ داری قبول کی۔

تحریک جہاد اسلامی کا آغاز غزہ سے ہوا ہے۔ غزہ کے ایک مقام نابلس میں یہودی فوجی دستے اور فلسطینی نوجوانوں کے درمیان ایک شدید معرکہ ۲۹ نومبر ۱۹۸۶ء کو ہوا جس میں چار مسلمان

شہید ہوئے اور ایک بڑی تعداد زخمی ہوگئی - یہودی حکام کی چیرہ دستی کا یہ عالم تھا کہ زخمی ہونے والوں کو ہسپتال میں داخل کرنے سے انکار کر دیا گیا - اس صورتِ حال نے جذبات کو مشتعل کر دیا اور نہ صرف غزہ، اور مغربی کنارے بشمول القدس، الخلیل، بیت اللحم کے اندر بسنے والے مسلمانوں کے اندر غیظ وعضب کی لہر دوڑ گئی، بلکہ اس تحریک میں ۱۹۴۸ء کے اندر اسرائیل میں شامل ہونے والے فلسطینی علاقوں کے مسلمان بھی شامل ہو گئے -

اس تحریک کی نمایاں بات یہ ہے کہ یہ فلسطین کی مسجدوں سے اُٹھ رہی ہے - گو فلسطینی عوام کلیتہً نہتے ہیں، مگر وہ اینٹوں اور پتھروں سے یہودی سنگینوں کا مقابلہ کر رہے ہیں - تحریک کی طرف سے جو لٹریچر تقسیم کیا جا رہا ہے - اُس پر قرآن اور بندوق کا شعار درج ہے - عورتیں، بچے اور بوڑھے بھی اس تحریک میں شامل ہو چکے ہیں اور سب کی زبان پر ایک ہی نعرہ ہے :

خیبر خیبر یا یہود - جیش محمد سوف یعود

(اے یہودیو! محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا لشکر اسی طرح تمہاری طرف بڑھ رہا ہے جس طرح اس نے خیبر میں تمہیں ملیا میٹ کیا تھا)

تحریکِ جہادِ اسلامی نے اپنا جو منشور جاری کیا ہے اُس کے اہم حصے یہ ہیں :

" پچھلی نصف صدی سے پوری اُمتِ اسلامی اور خاص طور پر فلسطینی قوم جن تلخ اور سنگین تجربوں سے گزر رہی ہے اُن سے یہ ثابت ہو گیا ہے کہ اب جذبۂ جہاد سے سرشار مسلمانوں کو مختلف سطح پر اپنی ذمہ داریاں سنبھالنی چاہئیں - اور ان میں سرفہرست سرزمینِ اسلام فلسطین کا مسئلہ ہے "

" اُمتِ اسلامی کے تمام اہم مسائل اس وقت تک ہوا کے جھونکوں کے حوالے رہیں گے اور دشمنانِ اسلام جس طرح چاہیں گے اُن سے کھیلتے رہیں گے جب تک اُمت کے بہادر عوام " لا الٰہ الا اللہ " کا علم بلند نہیں کرتے اور اپنے عقیدے اور اپنی روشن تاریخ اور اپنے اسلامی وطن کا اللہ کے بھروسے پر اُٹھ کر دفاع نہیں کرتے - ان کا راستہ جہاد اور قربانیوں کا راستہ ہے "

" یہ تحریک کسی بین الاقوامی تنظیم کی شاخ نہیں ہے اور نہ کسی ایسی فلسطینی گروہ سے

تابع ہے جو غیر سیاسی ہے۔ یہ تحریک ایک نومولود اسلامی جماعت ہے اور اس کا بیرونِ فلسطین کسی تنظیم سے کوئی تعلق نہیں ہے"۔

"اس تحریک کی عسکری سرگرمیاں اور عوام کے تعاون سے اس کی جدوجہد تیز تر ہوتی جا رہی ہے۔ اس کی پالیسی اور پلاننگ اتنی ہی واضح اور روشن ہے، جتنا قرآن اور سنتِ رسول ؐ واضح اور روشن ہے"۔ (المجتمع ۱۵ دسمبر ۱۹۸۶ء)

اس زبردست پروپیگنڈے کے باوجود تحریک جہاد نے غیر معمولی مقبولیت حاصل کر لی ہے۔ اسے صحیح معنوں میں فلسطینی عوام کے جذبات کی عکاسی اور ان کی دبی ہوئی امنگوں کا آئینہ کہا جا سکتا ہے۔ مسجدوں میں لوگ جمع ہو کر مظاہروں اور جلوسوں کی شکل میں نکل رہے ہیں اور اپنے سینوں کو صیہونی گولیوں سے چھلنی کروا رہے ہیں۔ غزہ اور بعض دیگر علاقوں کو فوج کے حوالے کیا جا چکا ہے، مگر تشدد کی ہر کارروائی فلسطینی مجاہدین کے جوش و خروش میں اضافہ کرتی جا رہی ہے۔ یہودی قوم جس نے امریکہ کی امداد اور اپنی دولت کے بل بوتے پر دنیا کے اندر اپنے غیر معمولی قوم ہونے کا پروپیگنڈا برپا کر رکھا ہے فلسطینی مجاہدین کے آگے اُس کا پول کھلتا جا رہا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے یہودیوں کی بزدلی بیان کرتے ہوئے فرمایا ہے کہ "یہ دیواروں کی آڑ میں تم سے لڑ سکتے ہیں۔ سامنے نہیں آ سکتے"۔

یہودی نئی تحریکِ جہاد سے انتہائی خائف ہیں۔ ایک طرف یہودی جرنیل روفائیل ایتان جو لبنان کے اندر ناکام ہو چکا تھا، یہ مطالبہ کر رہا ہے کہ ہر اُس فلسطینی کو موت کی سزا دے دی جائے گی جس کے پاس ریوالور یا چھری تک پائی جائے اور دوسری طرف لیکود پارٹی کا رکن موشے عمراف تنظیمِ آزادیٔ فلسطین سے ہمدردی رکھنے والے افراد سے مل کر انہیں قائل کرنے کی کوشش کر رہا ہے کہ وہ "اسرائیلی فلسطینی کنفڈریشن" کو قبول کر لیں۔ اس کنفڈریشن کی رُو سے دریائے اُردن کے مغربی کنارے پر عمومی اقتدار اسرائیل کا ہو، مگر مقامی انتظامیہ فلسطینی ہو، جھنڈا بھی فلسطین کا لہرائے اور ڈاک کے ٹکٹ اور ترانہ بھی فلسطینی قومیت کا عکاس ہو۔ تحریکِ جہاد اسلامی اور اسرائیل کے فلسطینی عوام اس پیش کش کو مسترد کر چکے ہیں۔

اسرائیل کی فلسطینی آبادی کو پچھلے چالیس سالوں میں کم سے کم کرنے کی مسلسل کوشش کی گئی ہے مگر اسرائیلی حکام کی تمام تر کوششیں بے سُود ثابت ہوئی ہیں۔ جریدہ المجتمع (۲۲ دسمبر ۱۹۸۶ء) کے

مطابق اس وقت فلسطین کے اُن حصّوں میں جن پر ۱۹۴۸ء میں اسرائیل کی منحوس اور ناجائز ریاست قائم کی گئی تھی، ۶ لاکھ فلسطینی رہتے ہیں۔ انہیں "اسرائیلی شہری" کہا جاتا ہے۔ پچھلے چالیس سالوں میں ان کے ذہنوں سے عرب اور مسلمان ہونے کے احساس کو کھرچنے کی پوری منصوبہ بندی کی گئی ہے، جو سراپا ناکام ہوئی ہے۔ موجودہ تحریک میں وہ لوگ بھی پوری طرح شامل ہو چکے ہیں۔ اسی طرح مغربی کنارے میں بھی ۸ لاکھ فلسطینی اور غزہ کی پٹی میں بھی ۶ لاکھ فلسطینی آباد ہیں۔ یہ دو ملین آبادی جس کے اندر قدرت نے اسلام کی رُوح پھونک دی ہے، آخر کار اسرائیل سے نجات حاصل کر کے رہے گی۔

ڈاکٹر عبدالعزیز خیاط وزیر اوقاف اُردن کے بیان کے مطابق اس وقت فلسطین کے اندر ۷۵۰ مسجدیں ہیں۔ جن میں تین ہزار خطیب و امام ہیں۔ یہ تمام مساجد مجاہدین کے مورچے بن رہی ہیں۔ مزید برآں مسجد اقصیٰ کے اندر اسلامی تربیت گاہ قائم ہو چکی ہے۔ اسی طرح اسلامی یونیورسٹی غزہ کے تحت تین کالج، القدس کالج اور ایک کالج قلقیلیہ میں اور چار ثانوی اسلامی مدارس مغربی کنارے کے مختلف حصوں میں کچھ عرصے سے قائم ہیں۔ ان تمام اداروں کے اخراجات اسرائیل کے فلسطینی عوام اور اُردن کی وزارتِ اوقاف برداشت کرتی ہے۔ ان کے اندر تعلیم پانے والے لڑکے اور لڑکیاں ذلت و رسوائی کی زندگی سے تنگ آ چکے ہیں اور اب جہاد کے بغیر ان کے لیے کوئی راستہ نہیں ہے۔

اسرائیل کے اندر اُٹھنے والی تحریکِ جہاد کی کامیابی کے لیے ضروری ہے کہ پوری دُنیا کے مسلمان اس کا ساتھ دیں۔ اسرائیل کو امریکہ، روس اور دُنیا کی عیسائی طاقتوں کی پشت پناہی اور تائید حاصل ہے۔ یہ طاقتیں ہرگز یہ برداشت نہ کریں گی کہ افغانستان کے بعد فلسطین کے اندر اسلامی بنیادوں پہ جدوجہد آزادی کا شرارہ بلند ہو جائے۔ اس لیے ملّتِ اسلامیہ کو اُسی جذبے کے ساتھ تحریکِ جہادِ فلسطین کی امداد کرنی چاہیے جس جذبے کے ساتھ اُس نے افغانستان کے جہاد سے دلچسپی لی ہے۔

اسلام میں اختلاف کے آداب

(۹)

قرونِ خیر کے بعد اختلاف، اور اس کے آداب

ترجمہ وتلخیص جناب عبدالحی ابڑو صاحب - اسلامی یونیورسٹی - اسلام آباد -

چوتھی صدی ہجری کے آغاز میں آفتابِ اجتہاد غروب ہوتے ہی مخصوص فقہی مسالک کی تقلید کا دستور رائج ہوگیا تھا - چنانچہ ابوطالب مکیؒ اپنی کتاب "قوت القلوب" میں فرماتے ہیں:

"لوگوں کی (یہ فقہی) تصانیف وتالیف تو بعد کی چیزیں ہیں - پہلی اور دوسری صدی ہجری میں لوگوں کے اقوال (بطور حجتِ شرعی) پیش کرنے کا رواج نہ تھا - اور نہ یہ قاعدہ تھا کہ کسی ایک شخص کے مذہب پر فتویٰ دیا جائے، ہر مسئلہ اور معاملہ میں اسی کی آراء کو مانا اور بیان کیا جائے اور اسی کے مذہب کو مدارِ یقین قرار دے لیا جائے"۔[1]

تیسری صدی ہجری میں جب کہ اجتہاد کا عمل ابھی جاری تھا، اگرچہ بعض علماء نے اپنے پیشرو اہلِ علم کے مقرر کردہ قواعد اور اصولوں کی روشنی میں مسائل کی تخریج اور استنباط کا کام ضرور انجام دیا، مگر ان کی تقلیدِ شخصی یا صرف انہی کی آراء پر کبھی انحصار نہیں کیا۔

چوتھی صدی ہجری میں اس صورتِ حال میں کچھ تبدیلی واقع ہوئی - اس وقت لوگوں کے دو طبقے

---

[1] بحوالہ حجۃ اللہ البالغہ ص ۳۲۱

تھے۔ ایک طبقہ علماء اور دوسرا طبقہ عوام۔ عوام کا حال یہ تھا کہ وہ اجتماعی اور اصولی مسائل میں جو تمام مسلمانوں یا عام اربابِ اجتہاد کے درمیان متفق علیہ تھے، براہِ راست حضور اکرم علیہ الصلوٰۃ والسلام سے روایت کردہ احادیث کی پیروی کیا کرتے تھے، طہارت، نماز، روزے اور زکوٰۃ وغیرہ کے مسائل علماء سے سیکھ لیتے اور اسی کے مطابق خود عمل کرتے۔ اور جب کوئی غیر معمولی واقعہ پیش آتا تو جو مفتی انہیں میسر آتا، بلالحاظِ مسلک و مذہب، اس سے فتویٰ پوچھ لیتے۔

جہاں تک اہلِ علم اور خواص کا تعلق تھا تو حدیث سیکھنے اور سکھانے کے عمل میں مشغول رہنے کی وجہ سے ان حضرات کے پاس احادیثِ رسول اللہؐ اور آثار صحابہؓ و تابعین کا اتنا ذخیرہ ہوتا کہ اس کی موجودگی میں مسئلے کے حل کے سلسلے میں کسی اور چیز کی ضرورت پیش نہیں آتی تھی۔ البتہ روایات و آثار کے باہمی تعارض کی صورت میں اگر ترجیح کی کوئی شکل واضح نہ ہوتی اور وہ مطمئن نہ ہوتے تو گذشتہ فقہاء کے اقوال کی طرف رجوع کرتے اور اگر وہاں بھی انہیں کسی مسئلے میں مختلف آراء نظر آتیں تو اہلِ مدینہ یا اہلِ کوفہ میں سے جس صاحبِ علم کی رائے کو دلیل کے لحاظ سے مضبوط اور مستند پاتے اُسے اختیار کر لیتے تھے۔

جن علماء میں مسائل کی تخریج کی صلاحیت ہوتی وہ نئے پیش آمدہ مسائل کا حکم معلوم کرنے کے لیے فقہاء کے مقرر کردہ قواعد کی روشنی میں اجتہاد و استنباط سے کام لیتے تھے اور وہ جس مسلک کے قواعد کے مطابق استنباط کا کام سرانجام دیتے — خود انہیں بھی اسی مسلک کی طرف منسوب کیا جاتا تھا۔ اگرچہ وہ اپنے پیش روؤں کی طرح صرف کسی ایک مکتبۂ فکر یا مسلک کی پابندی نہیں کرتے تھے، جیسا کہ بعد کے ادوار میں ہونے لگا۔ اسی نسبتِ مسلک کے لحاظ سے کہا جاتا ہے کہ فلاں شافعی ہے اور فلاں حنفی حتیٰ کہ کسی ایک مسلک سے زیادہ مطابقت کی وجہ سے محدثین کو بھی مختلف مسالک کی طرف منسوب کیا جاتا تھا۔ مثال کے طور پہ نسائی، بیہقی اور خطابی شافعی مکتبۂ فکر کی طرف منسوب کیے جاتے تھے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس دور میں بھی منصب قضاء اسی کو سونپا جاتا جو اجتہادی بصیرت رکھتا تھا۔ نیز کسی عالم کو فقیہ اسی صورت میں کہا جاتا جب وہ اجتہاد کی صلاحیت سے بہرہ ور ہوتا۔

چوتھی صدی ہجری کے بعد حالات کا رُخ چوتھی صدی ہجری میں حالات نے جو رُخ اختیار کیا ان کا ذکر کرتے ہوئے حجۃ الاسلام امام غزالیؒ (متوفی ۵۰۵ھ) فرماتے ہیں:

"رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد جن خلفائے راشدین نے بارِ خلافت اٹھایا انہیں اللہ تعالیٰ کی معرفت حاصل تھی اور وہ احکام و معاملات میں کمال تفقہ کے حامل تھے۔ لہٰذا نئے پیش آمدہ مسائل میں وہ خود ہی فتویٰ دیا کرتے تھے اور دوسرے فقہا سے وہ صرف اسی صورت میں مدد لیتے تھے، مشورہ ناگزیر ہوتا۔ اس دور کے علماء کرام نے اپنے آپ کو علمِ آخرت کے لیے وقف کر لیا تھا۔ اور لوگوں کے مسائل و معاملات میں فتویٰ کے کام کو وہ ایک دوسرے پر ٹالنے اور خود کو پورے انہماک کے ساتھ اللہ کی یاد میں محو رکھنے کی کوشش کرتے تھے۔ خلفائے راشدین کا مبارک دور جب ختم ہو گیا تو زمامِ خلافت ایسے لوگوں کے ہاتھ میں آئی جو نہ اس امانت کے اٹھانے کی صلاحیت رکھتے تھے اور نہ علمِ فتاویٰ اور احکامِ شریعت سے گہرا لگاؤ رکھتے تھے۔ اس لیے وہ مقدمات فیصل کرنے اور قضائے شرعی جاری کرنے کے لیے فقہاء سے مدد لینے پر مجبور ہو گئے اور ہر وقت انہیں اپنے ساتھ رکھنا ان کی ضرورت بن گیا۔ (اگو خیر القرون کا دور ختم ہو چکا تھا، مگر پھر بھی) ایسے علماء سے دنیا خالی نہ تھی جو قدیم رنگ پر مضبوطی سے قائم تھے اور اخلاصِ دینی کو اپنی عزیز ترین متاع سمجھتے تھے حکومتیں انہیں جتنا بھی اپنی طرف راغب کرنے کی کوشش کرتیں وہ ان سے اتنا ہی زیادہ دور ہوتے چلے جاتے۔

جاہ پسند لوگوں نے جب علماء کی یہ آؤ بھگت دیکھی اور اپنے اعراض اور استغنا کے باوجود انہیں اربابِ حکومت کا مطلوبِ خاطر بنا ہوا پایا تو ان کے دلوں میں بھی اس ذریعۂ عزت و اقبال (یعنی) علمِ دین کے حاصل کرنے کا انتہائی شوق پیدا ہو گیا تاکہ اسے بازار میں لا کر عزت و شرف کا سودا کر سکیں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ درباری علماء و فقہا کا ایک طبقہ پیدا ہو گیا۔ اور کل تک جو طبقہ سلاطین سے منہ موڑنے کی بدولت باعزت تھا خود سلاطین کے طواف نے ان کی عزت ذلت میں بدل دی۔ اِلّا ماشاءاللہ۔

اس زمانے میں چونکہ اسلامی ممالک اور علاقہ جات کے حالات و ضروریات کے پیشِ نظر

فقہی مسائل اور علمِ فتویٰ کی اشد ضرورت بھی لہٰذا اس دور میں علمِ فتویٰ پر سب سے زیادہ توجہ دی جاتی تھی۔ مگر بعد میں جب اُصولِ عقائد اور علمِ کلام کے مناظروں میں دلچسپی لینے والے چند خلفاء اور سلاطین پیدا ہو گئے تو یہ حضرات بھی علمِ کلام میں مشغول ہو گئے، انھی علوم و فنون کی کتابیں تصنیف کی جانے لگیں اور مناظروں اور مباحثوں کے طریقے مرتب کیے جانے لگے۔ جس طرح اہلِ فتویٰ کا دعویٰ تھا کہ ان کا مقصد لوگوں کے دینی مسائل کا حل پیش کرنا اور ان کی دین سے وابستگی کو برقرار رکھنا ہے، اسی طرح یہ لوگ بھی اپنی اس ساری جدوجہد کا مقصد یہ بیان کرتے تھے کہ وہ بھی اس کے ذریعہ خدا کے دین اور سنّتِ نبوی کو بدعات و خرافات سے پاک رکھنا چاہتے ہیں۔

جب تک اِس میدان میں اہلِ علم کا غلبہ رہا۔ اس علم کی بنیادیں بھی استوار رہیں۔ مگر پھر ایک وقت ایسا بھی آیا کہ ناپختہ کار لوگ بھی علمِ کلام میں دخل اندازی کرنے اور مناظروں میں دلچسپی لینے لگے جس سے تعصب و تشدد سے بھرپور جنگ و جدال کے مناظرے ہونے لگے اور نوبت قتل و غارت تک پہنچ گئی۔

رفتہ رفتہ جدل اور مناظروں کا شوق لوگوں میں اس قدر بڑھ گیا کہ بعض ناپختہ افراد نے فقہی مسائل میں بھی اس طرزِ عمل کو رواج دیا۔ انھیں اس بات کی وضاحت کا بڑا شوق تھا کہ فلاں مسئلہ میں اَولیٰ مسلک، مسلکِ حنفی ہے یا مسلکِ شافعی؟ نتیجہ یہ ہوا کہ تمام اربابِ فن، کلام اور دیگر علوم کے میدانِ تحقیق و جستجو سے نکل کر اختلافی مسائلِ فقہیہ کے معرکے میں اُتر آئے۔ جہاں خاص طور سے حنفی اور شافعی مذاہب کو مناظروں کے لیے منتخب کر لیا گیا جبکہ امام مالک، امام احمد بن حنبل، سفیان ثوری اور دوسرے آئمہ کے مذاہب سے مناظرانہ موشگافیوں کے لیے لوگوں نے دلچسپی نہ لی (جس کا واضح سبب غالباً یہ تھا کہ اُمراء و خلفاء کو صرف حنفیت اور شافعیت ہی کے مناظروں سے دلچسپی تھی)۔

ستم یہ کہ وہ اپنی اس مساعی پر نازاں بھی تھے اور ان کا خیال تھا کہ وہ اس طرح شریعت کے نہ صرف یہ کہ اسرار و دقائق کا استنباط کر رہے ہیں بلکہ ہر مذہب کے علل اور مصالح بیان کر کے اُصولِ فتویٰ کو مدوّن کرنے کی راہ ہموار کر رہے ہیں۔ اِس خیال کے تحت انھوں نے

تصنیفات اور استنباطات کا ڈھیر لگا دیا اور بحث وجدال کے گوناگوں اسلحہ ایجاد کر ڈالے۔ افسوس کہ وہ اب تک اسی روش پر چلے جا رہے ہیں اور نہیں معلوم کہ مستقبل میں کیا ہونے والا ہے۔"

مندرجہ بالا تحریر کا جائزہ لینے سے ہمیں درج ذیل چند چیزیں معلوم ہوتی ہیں:

۱- امام غزالی نے خلفائے راشدین کے بعد امتِ مسلمہ کو لاحق ہونے والے اصل روگ کی بنیاد فکری اور سیاسی قیادت کے الگ الگ ہو جانے کو قرار دیا ہے اور جو ہماری تاریخ کا ایک ایسا بدنما داغ ہے جسے آج تک دُور نہ کیا جاسکا۔ یہ اسی کا نتیجہ تھا کہ ایک طرف اسلامی سیاست سے ناواقفیت کی بنا پر حکمران غیراسلامی سیاسی حرکتوں کا ارتکاب کرتے رہے اور دوسری طرف ہماری فقہ میں ایسے فرضی مسائل کی بھرمار ہوگئی جن کا نہ تو عملی زندگی سے کوئی تعلق تھا اور نہ ہی وہ روزمرہ زندگی کا اس طریقے پر کوئی حل پیش کرتے تھے جس طرح صحابہ وتابعین کے زمانے میں ہوا کرتا تھا۔ فقہ واُصولِ فقہ کے ضمن میں مذکور مسائل میں سے زیادہ تر حصہ اُن فرضی مسائل کا ہے جنھیں اختلاف اور مناظرہ بازی نے جنم دیا۔

۲- فقہ اسلامی، جو شریعت کے مقرر کردہ قواعد وضوابط کے تحت لوگوں کو روزمرہ زندگی میں پیش آمدہ مسائل کے حل کا ذریعہ تھی، رفتہ رفتہ حکومتِ وقت (چاہے اس کی نوعیت اور بنیاد کچھ بھی ہو) کی مددگار اور معاون بن کر اس کے ہر اقدام کے لیے وجہِ جواز فراہم کرنے کا ایک آلہ بن گئی۔ اس کا نتیجہ مسلمانوں کے قانونی نظام میں خلل اور عجیب قسم کی ناہمواری کی صورت میں نکلا۔ یہاں تک کہ ایک ہی شخص کا کوئی عمل ایک ہی جگہ اور ایک ہی وقت میں کسی کے ہاں جائز اور کسی کے ہاں ناجائز قرار پانے لگا۔ اس کا ثبوت کتبِ فقہ میں "ابواب المخارج والحیل"[۱]

---

[۱] حافظ ابن قیم نے حیلہ بازی کی ماہیت، قسموں اور ہر قسم کے حکم کے بارے میں اپنی کتاب اعلام الموقعین (۳/۲۰۰) میں خاصی طویل بحث کی ہے اور بہت سی مثالیں بھی ذکر کی ہیں جن میں سے کچھ یہ ہیں: کوئی قاتل خود پر سے قصاص ساقط کرنا چاہے اور اس کے لیے یہ صورت اختیار کرے کہ جسے قتل کرنا ہو اس کے جسم میں زخم لگا کر کوئی زہر آلود دوا اس میں ڈال دے یا اُسے زہریلی دوا (باقی بر صفحہ آئندہ)

(شرعی احکام سے راہ فرار کے راستے اور حیلے بہانے) کے نام سے وہ قواعد اور مثالیں ہیں جن سے ان کتابوں کے سینکڑوں اوراق کالے کیے گئے۔ اور جن میں مہارت کسی بھی فقیہ کے علمی مرتبہ و مقام اور برتری کی دلیل ہوا کرتی تھی۔ پھر جوں جوں وقت گزرتا گیا دین کی گرفت کمزور پڑتی گئی۔ اور یہ معاملہ شدت اختیار کر گیا۔ دوسری طرف مسائل شرعیہ کی بابت لوگ تساہل برتنے لگے۔ یہاں تک کہ بعض مفتی حضرات ایسے فتوے بھی صادر کرنے لگے جن کے متعلق ان کے پاس نہ صرف یہ کہ کوئی دلیل نہیں ہوتی تھی، بلکہ فتوے کی درستگی کا خود ان کو بھی یقین نہیں ہوتا تھا۔ زیادہ سے زیادہ وہ یہ کہہ دیتے کہ اس میں لوگوں کے لیے تخفیف اور نرمی ہے، یا ایسی سختی ہے جس کی وجہ سے حدود شریعت سے تجاوز کو روکا جا سکتا ہے۔ مثال کے طور پر وہ حکومتِ وقت کے بعض کارپردازوں کو ایسی رخصتیں دیتے جو عام مخلوق کے لیے نہیں ہوتیں[1]

(بقیہ حاشیہ صفحہ سابقہ)

پلادے تو اصحابِ حیل کہتے ہیں کہ اس پر قصاص واجب نہیں ہوگا۔ اس لیے کہ اُسے قاتل شمار نہیں کیا جائے گا۔ یہ ناقابلِ تسلیم حیلہ بازی ہے۔ اسی طرح کوئی شخص اپنے مرضِ موت میں بیوی کو وراثت سے محروم رکھنا چاہے اور اسی عالم میں اگر اُسے طلاق دے دے گا تو قاضی اُسے وراثت سے حصہ دلائے گا کیونکہ مرضِ موت کے دوران کی طلاق معتبر نہیں۔ تو اس کے لیے انہوں نے یہ حیلہ بتایا کہ بجائے طلاق دینے کے یہ دعویٰ کرے کہ میں نے اسے مرضِ موت سے پہلے تین طلاقیں دے دی تھیں۔ اِسی طرح بعض مال دار زکوٰۃ سے جان چھڑانے کے لیے یہ حیلہ اختیار کرتے ہیں کہ سال پورا ہونے سے تھوڑا عرصہ پہلے اپنا مال کسی کو بطور "ہدیہ" دے دیتے ہیں یا اُسے بیچ دیتے ہیں یا اپنی زکوٰۃ کسی تھیلی یا برتن میں رکھ کر اُسے مستحق کے حوالے کرتے ہیں گویا انہیں زکوٰۃ دے دی اور پھر اس سے واپس لے لیتے ہیں۔ یہ تمام صورتیں ناجائز ہیں۔ اس لیے کہ انسان کا معاملہ اللہ تعالیٰ علیم و خبیر سے ہے جو سارے پوشیدہ رازوں کو بخوبی جانتا ہے۔

[1] مناہج الاجتہاد فی الاسلام (محمد سلام مذکور) ص ۴۵۱-۴۵۰، اصول الاحکام (حمد کبیسی)، ص ۳۹۰۔

کوئی سائل عورت یا عضوِ تناسل کو چھونے کے بارے میں سوال کرتا تو جواب ملتا کہ امام ابوحنیفہ رح کے ہاں اس سے وضو نہیں ٹوٹتا۔

شطرنج کھیلنے یا گھوڑے کا گوشت کھانے کے بارے میں پوچھا جاتا تو کہتے: امام شافعی رح کے نزدیک یہ جائز ہے۔

ملزم کو مار پیٹ کرنے یا تعزیر دینے میں حدود سے تجاوز برتنے کے متعلق سوال کیا جاتا تو کہا جاتا: امام مالک رح اسے جائز ٹھہراتے ہیں۔

کسی وقف کی ملکیت جب بیکار ہو جائے، اس سے استفادہ ممکن نہ ہو، اور متولی کے پاس اُسے دوبارہ آباد کرنے کے لیے رقم بھی نہ ہو تو اُسے بیچنے کے لیے کوئی راستہ نکالنے کے لیے فتوی دیا جاتا کہ امام احمد کے مسلک کے مطابق اسے بیچنا جائز ہے۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ اہلِ خیر کی طرف سے وقف کردہ املاک ذاتی ملکیت میں تبدیل ہونے لگیں [1]

خدا کے خوف اور تقوی کے جذبہ میں جیسے جیسے کمی آتی گئی، مقاصدِ شریعت اور شرعی قواعد و ضوابط سے بھی غفلت اور روگردانی میں اضافہ ہوتا چلا گیا۔ یہاں تک کہ کچھ دریدہ دہن، نیم پاگل اور گمراہ شعراء احکامِ الٰہی کا مذاق اڑانے لگے۔ چنانچہ ابونواس کہتا ہے:

اباح العراقی النبیذ وشربه　　وقال حرامان: المدامة والسکر

وقال الحجازی الشرابان واحد　　فحلت لنا من بین قولیهما الخمر

ساخذ من قولیهما طرفیهما　　واشربها لافارق الوازر الوزر

(عراقی کہتے ہیں کہ نبیذ اور اس کے مشروب کا استعمال جائز ہے، البتہ شراب اور نشہ حرام ہے۔ حجازی کہتے ہیں کہ دونوں ایک ہی ہیں۔ اب دونوں باتوں سے شراب ہمارے لیے حلال ہو گئی۔ اب میں دونوں اقوال میں سے ہر ایک کا ایک ایک حصہ اختیار کرتے ہوئے شراب پیوں گا۔ اس طرح اس کے استعمال کی ذمہ داری سے بھی محفوظ رہوں گا)۔

---

[1] الارتسامات اللطاف: امیر شکیب ارسلان

علماء جن کا کام حدودِ دین کی حفاظت کرنا ہے اگر وہی پستی و ذلت کا شکار ہونے لگیں تو لوگوں کے درمیان دین کی کیا اہمیت باقی رہے گی؟ اس طرح نرمی اور آسانی پیدا کرنے کے دعوے کی بنیاد پر دین کی حدود کو پھلانگنا ایک ایسا جرم ہے جس کی لوگوں کی نظر میں یقیناً کوئی حیثیت اور وقعت نہیں ہوتی۔ دوسری طرف اربابِ فتویٰ نے جب ہیبت وعظمت کی دیوار خود اپنے ہاتھوں سے ڈھا دی اور اس کے فتووں میں نفسانیت کا جذبہ غالب آنے لگا تو ان کی سہل انگاری کے مقابلے میں ایک اور جماعت پیدا ہو گئی، جو فتوے وغیرہ میں انتہائی شدت اور سختی کی علمبردار تھی۔ ان کے نزدیک سائلوں کو مشکل احکام بتلانا خدمتِ اسلام سمجھا جانے لگا۔ ان کا خیال تھا کہ اسی طرح لوگوں کو عزیمت کی راہ اپنانے پر آمادہ کیا جا سکتا ہے۔ لیکن اکثر اوقات نتیجہ ان کی اُمنگوں کے برعکس نکلتا۔ لوگ دین کی پیروی میں جب آسانی کے بجائے دقت محسوس کرتے تو وہ دین ہی سے متنفر ہو کر اس پر عمل پیرا ہونے سے کنارہ کش ہو جاتے۔ اندلس کے ایک حکمران کا واقعہ ہے کہ اس نے مالکی مسلک کے ایک مفتی یحییٰ بن یحییٰ (متوفی ۲۳۴ھ) سے رمضان کے روزے کے دوران مجامعت کا کفارہ پوچھا تو انہوں نے جواب دیا کہ اس پر آپ لگاتار دو مہینے تک روزے رکھیں اور اس کا کوئی بدل بھی نہیں۔ حالانکہ شریعت میں کفارہ ادا کرنے کے سلسلے میں پہلا درجہ غلام آزاد کرنے کا ہے، انہیں یہی فتویٰ دینا چاہیے تھا، لیکن انہوں نے ایسا نہیں کیا۔ جب اس کی وجہ پوچھی گئی تو انہوں نے کہا: بادشاہ سینکڑوں غلام آزاد کر سکتا ہے، اس لیے اس کے لیے سخت حکم ضروری ہے اور وہ ہے روزہ[1]

اگر ہم تھوڑا سا بھی غور و فکر کریں تو ہم پر واضح ہو گا کہ اسلام امرِ واقعہ کا بہت زیادہ لحاظ رکھتا ہے اور اس کے احکام میں آسانی کا پہلو مدنظر رکھا گیا ہے۔ کیونکہ اسلام یہ چاہتا ہے کہ لوگ برضا و رغبت اس کے احکام کی پیروی کریں۔ اور انہیں کسی مشقت و تکلیف میں مبتلا نہ کیا جائے۔ ساتھ ہی وہ انہیں خواہشاتِ نفس کی پیروی کے لیے بالکل آزاد بھی نہیں چھوڑ دینا چاہتا۔ اگر یہ پیشِ نظر رہے تو افراط و تفریط کی دونوں صورتوں کا شارع کے مقصود کے خلاف ہونا

[1] البدایۃ والنہایۃ ۱۰/۳۱۲

بالکل واضح ہو جاتا ہے۔

علمائے دین کا بنیادی اور اہم فریضہ یہ ہے کہ وہ خدا تعالیٰ کے پیغام کو لوگوں تک بالکل اسی حالت میں پہنچاتے رہیں جس طرح اس نے اپنے رسولوں کے ذریعے اسے نازل فرمایا ہے۔ انہیں بے جا تشدید و تخفیف کا کوئی اختیار نہیں نہیں۔

قُلْ أَتُعَلِّمُونَ اللَّهَ بِدِينِكُمْ (الحجرات - ۱۶)

(اے نبیؐ ان (مدعیانِ ایمان) سے کہو: کیا تم لوگ اللہ کو اپنا دین بتاتے ہو۔

قُلْ أَأَنْتُمْ أَعْلَمُ أَمِ اللَّهُ (البقرہ: ۱۴۰)

(کہو: تم زیادہ جانتے ہو یا اللہ)

اللہ کے نزدیک جو چیز مقبول و معتبر ہے وہ بلا چون و چرا اس کے احکام کی پیروی و اتباع ہے اور جو چیز اس کلیہ سے ہٹ کر ہو وہ بدعت شمار ہوگی چاہے وہ تخفیف کی شکل میں ہو یا تشدید و تکلیف کی شکل میں۔

تصحیح

ترجمان القرآن شمارہ دسمبر ۱۹۸۷ء کے صفحہ ۱۹۵/۲۷ پر ایک آیت میں ذرا سی تصحیح کر لیں:۔

"یَا اَیُّھَا الرَّسُلُ" کے بجائے "یَا اَیُّھَا الرُّسُلُ" ہونا چاہیے

(ادارہ)

سُنّت

شارحِ قرآن ہے نہ کہ مخالفِ قرآن

جناب محمد رفیق چودھری ادارہ معارف اسلامی ۔ منصورہ

بعض لوگ کہتے ہیں کہ قرآن مجید میں جرمِ زنا کی سزا سے متعلق ایک ہی قطعی اور صریح حکم سورۂ نور میں موجود ہے کہ زانی مرد ہو یا عورت ، ان میں سے ہر ایک کو سو کوڑے مارے جائیں گے ۔ ان کی رائے میں یہ سزا ہر قسم کے زانیوں کے لیے ہے ، قطع نظر اس کے کہ وہ شادی شدہ ہوں یا غیر شادی شدہ ۔ لہٰذا شادی شدہ زانی کو سنگساری کی سزا دینا یا کنوارے زانی کو سو کوڑوں کی سزا کے علاوہ جلاوطنی کی سزا دینا ان کے نزدیک قرآن مجید کے حکم پر اضافہ کرنا ہے اور یہ خلافِ قرآن ہے ۔

ہمیں اس موقف سے شدید اختلاف ہے جس کی درجِ ذیل وجوہ ہیں :-

ا ۔ سورۂ نور کی آیتِ جلد میں جو سو کوڑوں کی سزا بیان ہوئی ہے وہ ہر قسم کے زانیوں کے لیے قرآن مجید کا عام ، قطعی اور صریح حکم نہیں ہے ۔ بلکہ یہ سزا صرف آزاد (اور از روئے سنت غیر شادی شدہ) زانی مرد اور عورت کے ساتھ خاص ہے ۔ زانیہ لونڈی (اور پھر تبعاً غلام بھی) اس حکمِ قرآنی میں شامل نہیں ۔ کیونکہ ان کے لیے قرآن مجید کی سورۂ نساء آیت ۲۵ میں یہ صراحت موجود ہے کہ :

" ..... جب وہ لونڈیاں قیدِ نکاح میں آجائیں تو پھر اگر وہ بدکاری کا ارتکاب کریں تو جو سزا محصنات یعنی آزاد عورتوں کے لیے مقرر ہے ، اس کی نصف سزا

اُن کو دی جائے گی۔"

اس سے معلوم ہوا کہ زانیہ لونڈی کو آزاد زانیہ عورت کی سزا کا نصف یعنی پچاس کوڑوں کی سزا قرآن مجید کی رُو سے مقرر ہے۔ لہٰذا کسی مدعی کا یہ دعویٰ کہ سورۂ نور کی آیتِ جَلد کا حکم ہر قسم کے زانیوں کے لیے قطعی اور صریح ہے اور اس میں کسی قسم کی کوئی تخصیص نہیں ہو سکتی، قرآن مجید سے عدم واقفیت کی دلیل ہے۔ کیونکہ خود قرآن مجید ہی سے زانیہ لونڈی کے لیے اس آیت کے حکم میں تخصیص ثابت ہے۔ اور پھر اسی سے یہ بات بھی از رُوئے قرآن ثابت ہو گئی کہ سورۂ نور کی آیتِ جَلد کا حکم ہر قسم کے زانیوں کے لیے قطعی صریح اور عام نہیں ہے۔

۲۔ فقہ اسلامی کا ایک مسلّمہ اُصول ہے جسے فقہاء کرام نے تسلیم کیا ہے کہ جب قرآن مجید کے کسی بظاہر عام حکم میں خود قرآن مجید نے کوئی تخصیص کر دی ہو تو اس کے بعد سنّت سے (بلکہ قیاس سے بھی) اس میں مزید تخصیص ہو سکتی ہے۔ مثال کے طور پر قرآن مجید کی سورۂ بقرہ آیت ۱۸۵ میں ماہ رمضان کے روزوں سے متعلق جملہ مسلمانوں کے لیے یہ حکم موجود ہے:

"تم میں سے جو کوئی اس مہینے کو پائے تو اُسے چاہیے کہ اُس کے روزے رکھے۔"

قرآن مجید کے الفاظ سے بظاہر یہ حکم [illegible] ماہ رمضان میں بقید حیات ہو، وہ ضرور [illegible] لیکن اس کے بعد ہی ارشاد ہوا کہ:

"اور جو کوئی مریض ہو یا حالتِ سفر میں ہو تو وہ اور دنوں سے قضا روزوں کی گنتی پوری کر لے۔"

اس طرح روزوں کے اس حکم میں مریض اور مسافر کے لیے تخصیص ہو گئی جس کے نتیجے میں قرآن مجید کا پہلا حکم عام نہ رہا۔ پھر سنّت کے ذریعے اسی حکم میں حائضہ عورت کے بارے میں بھی تخصیص ہو گئی کہ وہ بھی ا[illegible]ل حکم میں شامل نہیں ہے۔ اور اس کے لیے بھی یہ حکم ہے کہ وہ بھی روزے قضا کرے گی اور بعد میں گنتی پ[illegible]رے گی۔

بعینہٖ قرآن مجید کی سورۂ نور میں [illegible]کوڑوں کی سزا کا حکم آیا ہے جو بظاہر عام حکم ہے مگر اس سے پہلے خود قرآن مجید نے سورۂ نساء آیت ۲۵ کے مطابق اس حکم میں زانیہ لونڈی کی

تخصیص کر دی کہ وہ اس حکم میں شامل نہیں ہے، بلکہ اُسے آدھی سزا دی جائے گی۔ یوں خود قرآن مجید نے آزادی اور غلامی کی علت سے جرمِ زنا کی سزاؤں میں فرق کیا ہے۔ اس کے بعد سنت کے ذریعے اس حکم میں شادی شدہ زانیوں کی مزید تخصیص ہوئی ہے کہ وہ بھی اس حکم میں شامل نہیں ہیں۔ بلکہ ان کے لیے سنت نے الگ سے رجم یعنی سنگساری کی سزا کا حکم دیا ہے۔ آخر اس سے قرآن مجید کی خلاف ورزی کہاں لازم آتی ہے۔

۳ — فقہائے کرام اور مفسرین عظام کا یہ ایک اصول ہے کہ قرآنِ مجید کی کسی آیت کا جو مطلب و مفہوم سنت سے ثابت ہو جائے، وہی معتبر، قابلِ حجت اور واجب العمل ہے، خواہ وہ لغت کے خلاف ہی کیوں نہ ہو۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ سنت اوّلین شارحِ قرآن ہے۔ اور خود قرآن مجید نے اسے اپنی شرح و تفسیر کرنے اور معنی و مفہوم متعین کرنے کا غیر مشروط حق دیا ہے۔ مثال کے طور پر سورۂ نحل کی آیت ۴۴ میں ہے:

"اور ہم نے آپؐ کی طرف ذکر یعنی قرآن مجید نازل کیا ہے تاکہ آپؐ لوگوں کے سامنے وہ چیز کھول کر واضح کر دیں جو ان کے لیے نازل ہوئی ہے۔"

قرآن مجید کی شرح و تفسیر کے اسی اختیار کے مطابق سنت نے قرآنی الفاظ مثلاً صلوٰۃ، زکوٰۃ، صوم اور حج وغیرہ کے خاص مطالب و مفاہیم بیان کیے ہیں جو لغت سے بالکل مختلف ہیں۔ مگر قرآن مجید کے ان الفاظ کا صرف وہی مفہوم معتبر، حجت اور واجب العمل ہے جسے سنت نے بیان کر دیا ہے۔ یا پھر مثال کے طور پر سورۂ مائدہ کی آیت ۳۸ میں ہے:

"چور مرد اور چور عورت دونوں کے ہاتھ کاٹ ڈالو۔"

اس آیت میں اصل قرآنی لفظ "اَیْدِیَھُمَا" آیا ہے جس کے لغوی معنی "دونوں کے سارے ہاتھ" کے ہیں۔ کیونکہ اَیدی جمع ہے ید کی اور عربی زبان میں جمع کا اطلاق دو پر نہیں بلکہ کم سے کم تین کے عدد پر ہوتا ہے۔ اِس طرح اِس آیت کا لغوی مفہوم یہ ہوگا کہ چور مرد اور چور عورت دونوں کے سارے ہاتھ کاٹ ڈالے جائیں۔ مگر سنت سے یہ ثابت ہے کہ چور کا صرف ایک ہی ہاتھ کاٹا جائے گا۔ اور وہ بھی دایاں ہاتھ کاٹا جائے گا۔ اب یہاں پر لغت اور سنت کا اختلاف ہو گیا۔ ایسی صورت میں لغوی مطلب و مفہوم چھوڑ دیا جائے گا۔ اور سنت کے بیان کردہ

مطلب و مفہوم پر عمل کیا جائے گا۔ یہ نہیں کہا جائے گا کہ سنت کا یہ حکم قرآن مجید کے خلاف ہے۔
ایک اور مثال پیش نظر رکھیے۔ قرآن مجید کی سورۂ بقرہ آیت ۲۸۲ میں ہے:

"اور تم گواہ بنا لیا کرو جب خرید و فروخت کرو"۔

اب اگر قرآن کو محض لغت سے سمجھنے کی کوشش کی جائے گی تو خرید و فروخت کے ہر معاملے پر گواہ بنانے کے لیے قرآنی حکم پر عمل کرنا واجب ہو جائے گا۔ مگر سنت نے عام بیع و شراء کے لیے گواہوں کی پابندی نہیں لگائی ہے۔ لہٰذا اس قرآنی عبارت کا لغوی مفہوم نہیں لیا جائے گا جس کے تحت عام خرید و فروخت کے وقت گواہوں کا تقرر ضروری ہو، بلکہ سنت سے معلوم اور ثابت مفہوم ہی کو معتبر، حجت اور واجب العمل سمجھا جائے گا اور عام خرید و فروخت کرتے وقت گواہوں کا ہونا ضروری نہیں رہے گا۔ اسی طرح سورۂ نور کی آیتِ جلد کا جو مفہوم سنت سے ثابت ہے وہی حجت ہے نہ کہ لغت کے ذریعے سمجھا ہوا کوئی اور مطلب۔

۴- سنت گریز حضرات کی عادت ہے کہ وہ قرآن مجید کی شرح و تفسیر میں سنت کے ہر حکم کو خلافِ قرآن کہہ کر رد کر دیتے ہیں۔ ان کے نزدیک چونکہ قرآن مجید میں پانچ نمازوں کی صراحت نہیں ہے اس لیے ان کے ہاں پانچ نمازیں خلافِ قرآن ہیں۔ زکوٰۃ کی ڈھائی فیصد شرح قرآن مجید میں مذکور نہیں ہے۔ اس لیے وہ اس شرح کو بھی خلافِ قرآن سمجھتے ہیں۔ اسی طرح ان کی رائے میں چونکہ شادی شدہ زانی کے لیے سنگساری کی سزا قرآن مجید میں نہیں ہے اس لیے وہ اسے بھی خلافِ قرآن کہتے ہیں۔ سیدھی بات یہ ہے کہ سنت نے سورۂ نور کی آیتِ جلد کا حکم غیر شادی شدہ آزاد زانیوں کے ساتھ خاص کیا ہے اور شادی شدہ آزاد زانیوں کے لیے علیحدہ سے رجم کی سزا بتائی ہے۔ اور یہ سزا بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے وحیِ الٰہی کے مطابق مقرر کی ہے۔ آج تک پوری اُمت اسی بات کو صحیح سمجھتی رہی ہے۔ کیونکہ صحیح حدیث میں ہے:

"آگاہ رہو، مجھے قرآن دیا گیا ہے اور اس کے ساتھ اس کی مثل ایک اور چیز بھی دی گئی ہے"۔

اور سنت کے تمام احکام قرآن مجید کی اسی مثل یعنی دوسری وحیِ الٰہی کے زمرے میں آتے ہیں۔

۵ — حدِ رجم کے شرعی سزا ہونے کا انکار اُس وقت تک کسی شخص کے لیے ممکن نہیں جب تک کہ وہ تین درجن صحابہ کرام کی پچاس سے زیادہ روایاتِ صحیحہ بسلسلۂ رجم میں سے ایک ایک روایت کو لے کر محدثانہ طریق پر موضوع یا ضعیف ثابت نہ کر دے۔ کیونکہ جب تک کوئی صحیح حدیث موجود ہے اور اس کا حکم سنت ثابتہ کی حیثیت سے پوری اُمت کے ہاں مُسلّم ہے، اُسے محض اس بنا پر رَد نہیں کیا جا سکتا کہ اس سے قرآن مجید پر اضافہ ہو گیا ہے، اس لیے وہ خلافِ قرآن ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ سنت کے ذریعے قرآن مجید کے کسی حکم میں اضافہ یا اس کے مفہوم کی تعیین ہرگز خلافِ قرآن نہیں ہے، بلکہ عین منشائے قرآن مجید کے مطابق ہے۔ سورہ حشر آیت نمبر ۷ میں ارشادِ الٰہی ہے:

"اور رسول جو کچھ تمھیں دے وہ لے لو اور جس سے منع کرے اس سے رُک جاؤ۔"

اس آیت (اور اس طرح کی کئی دوسری آیاتِ قرآنی) کے مطابق خود قرآن مجید نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو غیر مشروط حقِ تشریع سونپا ہے اور ہر قسم کے اوامر و نواہی سے متعلق کلی اختیار دیا ہے اور ہر صاحبِ ایمان کے لیے اطاعتِ رسول کو لازم قرار دیا ہے۔ سنت گریز حضرات اس آیت کی معنوی تحریف کر کے یہ ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ جن اُمور میں قرآن مجید خاموش ہے صرف انھی اُمور میں سنت قابلِ قبول ہو سکتی ہے۔ اور جن اُمور میں قرآن مجید نے لفظاً یا اثباتاً کوئی حکم دے دیا ہے ان میں سنت کوئی تفصیل نہیں دے سکتی۔ یا بالفاظ دیگر کوئی اضافہ نہیں کر سکتی۔ اُن کا یہ خود ساختہ اُصول قطعاً غلط ہے، مثلاً قرآن مجید میں محرماتِ نکاح کی جو تفصیل موجود ہے۔ یعنی وہ عورتیں جن سے نکاح کرنا کسی شخص کے لیے حرام ہے۔ اس میں یہ حکم بھی ہے کہ کوئی شخص بیک وقت دو بہنوں سے نکاح نہیں کر سکتا۔ مگر قرآن مجید نے پھوپھی اور بھتیجی کو یا خالہ اور بھانجی کو بیک وقت نکاح میں رکھنے کی حرمت بیان نہیں فرمائی۔ جب کہ سنت میں ان دونوں صورتوں کی حرمت موجود ہے۔ کیا یہ دونوں اُمور قرآن مجید پہ اضافہ ہیں یا نہیں۔ اور اگر اضافہ ہیں تو کیا ان کو خلافِ قرآن سمجھ کر رَد کر دیا جائے گا۔

اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ آج اگر بالفرض آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بنفس نفیس ہمارے درمیان موجود ہوں اور وہ قرآن کے ساتھ سنت کو سرچشمۂ تشریع نہ ماننے والوں لوگوں سے یہ فرمائیں کہ "میں نے شادی شدہ زانی کے لیے رجم کی سزا مقرر کی ہے" تو ان حضرات سے یہ بعید نہ ہوگا کہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس صریح اور "عینی" حکم کو اس بنا پر رد کردیں کہ نعوذ باللہ "آپ کا یہ حکم تو قرآن مجید پر اضافہ ہے، اس لیے اسے ہم تسلیم نہیں کرتے"۔ اور نعوذ باللہ یہ کہ "آپ تو قرآن مجید نے اسلام میں کسی اضافے کے مجاز نہیں ہیں"۔ غور کیجیے بلکہ تدبر کیجیے کہ کیا اطاعت رسول کا یہی وہ معیار ہے جس کے لیے قرآن مجید نے جگہ جگہ حکم دیا ہے۔

۲- احادیث کے پورے ذخیرے سے کوئی شخص یہ ثابت نہیں کرسکتا کہ کبھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی شادی شدہ زانی کو قرآن مجید کے اس حکم کے تحت سو کوڑوں کی سزا دی ہو۔ یا خلافت راشدہ کے عہد مسعود میں کسی شادی شدہ زانی کو سو کوڑوں کی سزا دی گئی ہو۔ اس کے برعکس ان شاء اللہ ہم احادیث صحیحہ سے یہ ثابت کرسکتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے غیر شادی شدہ زانیوں کو سو کوڑوں کی سزا دی ہے اور شادی شدہ زانیوں پر سنگساری کی حد نافذ کی ہے۔

خلاصہ بحث یہ ہے کہ شادی شدہ زانی کے لیے رجم کی سزا اگرچہ قرآن میں مذکور نہیں ہے۔ مگر سنت میں موجود ہے اور سنت میں موجود ہونے سے اس کا حکم قرآن مجید پہ ہرگز اضافہ نہیں، سنت شارح قرآن ہے نہ کہ مخالف قرآن۔

مخالفین سنت کی ایسی بحثیں اول تو اس ایمانی و فکری تسلسل اور کتاب و سنت کے احکام کے متعلق قرون اولیٰ سے اب تک کی ذہنی وحدت و اجماع کے لیے تباہ کن ہیں۔ مزید یہ کہ دین کے خلاف ہونے والے حملوں میں ان کا وزن لادینیت پسندوں اور اباحیت کیش مجتہدین اور سیکولر اسلام کے علمبرداروں کے حصے میں جاتا ہے۔ اور موجودہ آزاد منش حکمرانوں کے ہاتھوں کو مزید مضبوط کرتا ہے، بلکہ اسلام کے متعلق جوان ذہنوں میں یہ انتشار بھی پیدا کرتا ہے کہ چند ملائے

ملکی، کچھ امامانِ دوراں اور بعض علامۂ زمان جس دین اور شریعت اور قانونی نظام کے لیے اپنے علمی ترکش اٹھائے میدانِ وغا میں قوت آزمائی کر رہے ہیں، اس کے ذریعے موجودہ زندگی کی الجھی ہوئی ڈور اور زیادہ الجھ جائے گی۔ لہٰذا وہ اسلامی قانون پر بحثیں کرتے رہیں اور عملاً کام اسی طرح چلتا رہے، جیسے ہے۔ بحثیں اٹھانے والے حضرات کو یہ چیزیں ضرور سامنے رکھنی چاہئیں۔

قیم جماعتِ اسلامی پاکستان کا اہم اعلان

مرکزی مجلسِ شوریٰ کے اجلاس منعقدہ ۱۸ تا ۲۱ دسمبر ۱۹۸۷ء میں جماعتِ اسلامی پاکستان کا نیا انتخابی منشور مرتب کرنے کے لیے ایک کمیٹی مقرر کی گئی ہے، جو انشاء اللہ فروری ۱۹۸۸ء کے آخری ہفتے میں منشورِ جماعت کی ترتیب و تیاری کا کام شروع کر دے گی۔ کمیٹی اپنا پہلا اجلاس منعقد کر چکی ہے۔

جماعت کے تمام ماتحت امراء، اہل الرائے حضرات اور برادر تنظیموں کے ذمہ دار حضرات اور مختلف شعبہ ہائے زندگی میں خصوصی دلچسپی اور مہارت رکھنے والے جملہ احباب سے اپیل ہے کہ وہ براہ کرم منشورِ جماعت کے سلسلے میں اپنی قیمتی آراء، اور اہم تجاویز ضلعی امراء کی وساطت سے یا براہ راست زیرِ دستخطی کو ۲۰ / فروری ۱۹۸۸ء تک بھیج دیں۔

یہ تجاویز پورے منشور کے سلسلہ میں بھی ہو سکتی ہیں اور کسی ایک شعبہ کے بارے میں بھی۔ والسلام محمد اسلم سلیمی۔ قیم جماعتِ اسلامی پاکستان منصورہ لاہور ۱۸

جدّہ سے ایک خط

از حامد احمد بن محفوظ

جدہ — ۶ر دسمبر ۱۹۸۷ء

آپ کا خلوص نامہ مورخہ ۸۷/۱۱/۴ کچھ دن قبل ہی مل چکا تھا۔ کچھ مصروفیات اور عدیم الفرصتی کے باعث جواب میں تاخیر ہو گئی ـــــ آپ کے حسبِ ارشاد مولانا عمر بن عبد اللہ بن محفوظ کے تعلق سے ایک مضمون ارسال خدمت کر رہا ہوں۔

مولانا عمر بن عبد اللہ بن محفوظ عربی النسل و حضر موت کے مشہور اور باعزت "بن محفوظ" قبیلے سے تھے۔ ضلع راج پور (کرناٹک۔ انڈیا) کے قصبہ لنگسگور میں پیدا ہوئے اور ابتدائی تعلیم کی تکمیل بھی وہیں سے کی۔ آگے تعلیمی سہولت نہ ہونے کی وجہ سے وہ حیدر آباد آئے اور مشہور مدرسہ "دار العلوم" سے میٹرک کی تکمیل کی۔ مولانا کو بچپن سے ہی علمی شوق رہا تھا۔ صوم و صلوٰۃ کے سخت پابند تھے اور لہو و لعب سے ہمیشہ اپنے آپ کو دُور رکھا ہوا تھا۔

علم کے شوق نے ایک قدم اور آگے بڑھایا اور جامعہ عثمانیہ میں انٹرمیڈیٹ میں داخلہ لیا۔ مضامینِ اختیاری کے طور پر دینیات و عربی کو منتخب کیا۔ بی۔اے اور ایم۔اے میں فقہ مضمونِ اختیاری تھا۔ ۱۹۴۵ء میں ایم۔اے کی تکمیل اعلیٰ درجے سے کی۔

ہائی اسکول کے زمانے سے ہی مولانا کو مطالعہ کا بہت شوق تھا۔ خصوصاً مولانا مودودیؒ صاحب کی کتابوں کے مطالعہ نے مرحوم کے خیالات اور عزائم کو کافی پختگی بخشی۔ جماعتِ اسلامی ہند کی جب تشکیل ہوئی تو مولانا محفوظ بڑے ہی خلوص اور عزم کے ساتھ اس کے رکن بنے۔

آپ ابھی کم عمر ہی تھے بلکہ مسیں بھی بھیگی نہیں تھیں کہ جماعتِ اسلامی حیدرآباد کے پہلے امیر (ناظم) منتخب کیے گئے۔ یہ اعزاز ان کے کردار، خلوص اور ذہنی افکار کی بنا پر ملا تھا۔ اس منصب پر فائز ہونے کے بعد تو مولانا نے تقریباً اپنے آپ کو وقف کر لیا تھا۔ اس کا ثبوت یہ ہے کہ حیدرآباد سروس کے تحت جو سرکاری ملازمت انہیں پیش کی گئی تھی، قبول کرنے سے یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ خارزارِ دُنیا کا یہ راستہ مجھے نہیں چاہیے جس پر چل کر دین کی صحیح خدمت نہیں کر سکتا۔

مناسب یہ ہے کہ یہ امر واقعہ بھی بیان کر دوں کہ ایم۔اے کی تکمیل کے بعد بزرگوں نے مرحوم کو کسی نہ کسی طرح راضی کر کے شادی کرا دی تھی تاکہ وہ اپنی ذمہ داریوں کو محسوس کریں اور مستقبل کے لیے کچھ سوچ سکیں۔ مالی اعتبار سے کمزور تھے لیکن کافی غیور تھے۔ باوجود معاشی تنگدستی کے اپنے خیالات یا افکار میں تبدیلی نہیں آنے دی، بلکہ عزائم اور پختہ ہوتے گئے۔ گھریلو ضروریات کی تکمیل ضروری تھی اس لیے حیدرآباد میں ہی معمولی سی دوکان کھول لی۔ ایک تو جماعت کی مشغولیت دوسرے دینی عقاید کی سخت پابندی، ظاہر ہے کہ کاروبار ناکام ہی ہونا تھا۔ مالی مشکلات سے متاثر ہو کر بالآخر تامل ناڈو (مدراس) کے ایک چھوٹے سے قصبہ میں تدریس کی خدمات قبول کر لیں۔ یہ ملازمت بھی چند ہی ماہ تک جاری رہ سکی، کیونکہ جماعتِ اسلامی کے کام کو آگے بڑھانے کے یہاں مواقع نہ تھے۔ اور نہ ہی جماعت کے ساتھی تھے۔ شدت سے تنہائی محسوس کر کے استعفیٰ داخل کیا اور حیدرآباد کے لیے رختِ سفر باندھا۔

حیدرآباد آ تو گئے لیکن وسائل آمدنی نہیں تھے۔ فیملی کی کفالت اور جائز اخراجات کا متحمل ہونا ناممکن ہو رہا تھا۔ ایسے میں اپنے بزرگوں اور قریبی احباب کے مشورے اور دباؤ سے مجبور ہو کر سعودی عرب روانہ ہوئے۔

آپ کی قابلیت اور "بن محفوظ" ہونے کے ناطے جدّہ کے نیشنل کمرشل بنک نے آپ کو سروس میں لے لیا لیکن معاوضہ انتہائی کم مقرر کیا گیا۔ آپ نے صبر کیا اور سروس کو جاری رکھا۔ آگے ترقی ہوتی رہی اور مالی وسائل سے بے فکر ہونے کا موقع ملا۔

جو شخص ایامِ شباب میں رسول اللہ کا شیدائی، اسلام کا سچا سپاہی اور حکومتِ الٰہیہ

کا علمبردار رہا تھا، آخر کار وقت اور حالات کے شدید دباؤ میں ساتھیوں اور اپنوں کے عدم تعاون کا شکار ہو کر بنک کی سروس کی طرف جھک گیا۔

یہ ضرور تھا کہ مرحوم مع اپنی فیملی کے خوش حال دور سے گذر رہے تھے، لیکن میرا احساس رہا کہ مرحوم اس سروس سے خوش اور مطمئن نہیں تھے۔ ایسا محسوس ہوتا تھا کہ سب کچھ ہے لیکن ایک پھانس سی ہے جو برابر ان کے قلب میں چبھ رہی تھی، اظہار نہیں کرتے تھے، بس قلب و دماغ اندر سے متاثر رہتے تھے۔

کسی بھی دینی مسئلہ پر بے باکانہ تبصرہ یا اظہار آپ کا خاص وطیرہ رہا ہے، چاہے مقابل میں کتنی ہی بڑی شخصیت کیوں نہ ہو۔

قلب کے مریض ہونے کے باوجود جدہ میں اپنی مدتِ حیات کے دوران مرحوم ہفتہ وار اجتماعات کو جاری رکھے ہوئے تھے، جہاں اہلِ ذوق اور دین کے شیدائی جمع ہوتے اور مسائلِ دینی سے مستفید ہوتے تھے۔

مرحوم کے تعلق سے آخر میں یہ بھی بتاتا چلوں کہ جہاں وہ اپنے اصولوں کے سخت ترین انسان تھے، وہیں پر بہت ہی خوش وضع، خلیق اور مزاح پسند بھی تھے۔ ضرورتاً ادبی و اخلاقی حدود میں ایسے لطائف یا نکات پیش کرتے کہ محفل لوٹ پوٹ ہو جاتی۔ خود بھی ہنستے اور دوسروں کو بھی ہنساتے۔ لیکن وائے افسوس یہ شخصیت ہم کو روتا چھوڑ کر راہیٔ ملکِ عدم ہوگئی۔ اللہ پاک مرحوم کو جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام عطا فرمائے۔ آمین۔

رسائل و مسائل

شمالی یورپ میں نماز روزے کا مسئلہ

سوال: جس جگہ میں رہ رہا ہوں یہ سویڈن کے بھی نارتھ کا علاقہ ہے اور اس جگہ کا نام لولیو ہے۔ یہاں آج کل (جون میں) بھی سخت سردی ہے اور ٹمپریچر کبھی 3-، 2- ہو جاتا ہے اور کبھی 5+ یا ۱۰+ ہو جاتا ہے۔ یہاں آجکل سورج طلوع 15-2 پر ہوتا ہے اور غروب 52-۱۰ پر ہو رہا ہے اور روز تین چار منٹ صبح پیچھے اور شام کو آگے ہو رہا ہے۔ اور یہ سلسلہ ۲۳ جون تک رہے گا۔ میرا بتانے کا مقصد یہ تھا کہ یہاں جو دو تین گھنٹے کی رات ہوتی ہے، اس میں بھی مغرب کا وقت ہوتا ہے اور تقریباً دن ہی ہوتا ہے۔ آپ میری اس سلسلے میں الجھن دور کر دیں تو مہربانی ہوگی۔ اور دوسرے یہاں جو تین چار مسلم گھرانے ہیں۔ ان کا بھی مسئلہ حل ہو جائے گا کہ یہاں رمضان کے اوقات بھی اور سحری افطاری کے اوقات کیا ہوں! (فی الحال تو میں نے طلوع اور غروب کے ساتھ ہی طویل روزے رکھے ہیں) اور دوسری بات یہ کہ نمازوں کے اوقات کیا ہوں (خصوصاً مغرب، عشاء اور فجر کے۔ اگر آپ یہ تفصیلات بذریعہ خط بتا سکیں تو آپ کی مہربانی ہوگی۔ یہاں سے چند سو کلومیٹر اوپر جو علاقہ ہے وہاں تو آج کل ضرور ایک گھنٹے کے لیے ہی سورج غروب ہو رہا ہے۔ امید ہے کہ آپ اس سلسلے میں تفصیلی جواب دیں گے۔ میں نمازیں طلوع غروب کے حساب سے پڑھ رہا ہوں۔

سردیوں میں یہاں دن تین یا دو گھنٹے کا ہو جاتا ہے تو تب رمضان اور نمازوں کے اوقات کا تعین کیسے ہوگا؟

۲۔ گائے، مرغی اور بکری وغیرہ کا گوشت اگر حلال نہ کیا گیا ہو تو وہ بالکل اسی طرح

حرام ہے جس طرح سؤر کا گوشت ۔ کیونکہ بعض لوگ کہتے ہیں کہ یہ سؤر کی طرح حرام نہیں ہے ۔ حالانکہ میرے علم کے مطابق یہ بالکل اسی طرح حرام ہے جس طرح سؤر کا گوشت یا مُردار ۔

جواب :- آپ روزے طلوع و غروب اور نمازیں بھی طلوع و غروب کے لحاظ سے پڑھتے ہیں تو ہماری رائے کے مطابق شریعت اسلامیہ کے تقاضوں کو صحیح معنوں میں ادا کر رہے ہیں ۔ لہٰذا اسی طرح سے اس سلسلے کو جاری رکھیے ۔ اللہ تعالیٰ آپ کو اس کی توفیق دے ۔ رات اڑھائی تین گھنٹے کی ہو تو اس میں عشاء کی نماز اور تراویح بھی پڑھنا چاہیے ۔ مغرب کی نماز کے پون گھنٹے، گھنٹے بعد عشا کی نماز اور تراویح پڑھ لیا کریں ۔

۲ ـــ آپ کے دوسرے سوال کا جواب یہ ہے کہ اگر گائے مرغی، بکری وغیرہ کو بسم اللہ پڑھے بغیر ذبح کیا گیا ہو یا ذبح ہی نہ کیا گیا ہو تو وہ مُردار ہے اور اس کا کھانا حرام ہے ـــ قرآنِ پاک اور احادیث کی نصوص صریحہ سے یہ بات ثابت ہے ۔ اس لیے ایک مسلمان کو دوسرے قطعی محرمات کی طرح اس حرام سے بھی بچنا چاہیے ۔ اللہ تعالیٰ سے دُعا ہے کہ وہ آپ جیسے مخلص لوگوں کی امداد فرمائے ۔ اور شریعت کے مطابق زندگی بسر کرنے کی آسانیوں سے نوازے ۔ آمین ۔

(ع ـ م)

مختارات

ملخّص از مکتوبِ مفتوح

جناب وقار احمد صدیقی صاحب - ۳۴ کے الاعظم اسکوائر فیڈرل بی ایریا، کراچی

مرتبہ: جناب آسی ضیائی صاحب - ادارۂ معارف اسلامی منصورہ

روزنامہ ڈان (۱۶ستمبر) میں جناب ہاشم رضا نے اپنے مضمون THE LESSON OF KARBALA کا آغاز اس عجیب و غریب دعوے سے کیا ہے:

IN THE HISTORY OF THE WORLD THE PAGE OF KARBALA WAS WRITTEN BY GOD IN COLLABO TION WITH HUSSAIN.

اللہ تعالیٰ اور حضرت حسینؓ کے باہمی ربط کے متعلق یہ اندازِ بیان مناسب نہیں معلوم ہوتا، بلکہ اس سے مزید ایک گمراہ کن خیال یہ بھی مستنبط ہوتا ہے کہ آنحضرتؐ کے بعد نبوت ختم نہیں ہوئی، اور آپؐ کے بعد بھی اللہ تعالیٰ کا رابطہ وحی کے ذریعے دیگر لوگوں سے ہو سکتا ہے۔ اور یہ تمام مسلمانوں کے متفق علیہ عقیدے کے خلاف ہے۔ ایک دانشور کو الفاظ کے انتخاب میں احتیاط سے کام لینا چاہیے تھا۔

دوسری اور اصل وجہ اعتراض، موصوف کا یہ کہنا ہے کہ:

ASCHOLAR OF ARABIC LANGUAGE HAS INTERPRITED THE LETTERS KAF, HA, YA, AIN, SWAD کٓھٰیٰعٓصٓ[1]

[1] از قبیلِ حروفِ مقطعات قرآنی وارد بہ آغاز سورۂ مریم۔

AS FOLLOWS :-

KAF	STANDS	FOR	KARBALA	ک برائے کربلا
HA	"	"	HILAKAT	ہ برائے ہلاکت
YA	"	"	YAZID	ی برائے یزید
AIN	"	"	ATASH (THIRST)	ع برائے عطش
SWAD	"	"	SABR	ص برائے صبر

حیرت ہے کہ موصوف نے نہ تو اس اسکالر کا نام بتایا اور نہ یہ کہ یہ بات انہوں نے کہاں سے نقل کی ہے، کیونکہ اس تحقیق کی کوئی نظیر پچھلے چودہ سو سال میں کہیں نہیں ملتی۔ اور مزید وجہِ تکلیف و حیرت یہ امر ہے کہ ایک "دانشور" ایسی توہم پرستانہ غیر اسلامی بات کہے، جب کہ حروفِ مقطعات کے بارے میں تمام مسلمان یہ مانتے ہیں کہ ان کا علم رسول اللہؐ کے سوا کسی کو نہیں دیا گیا۔ لیکن اگر عقلی و علمی کوشش کے بجائے کوئی شخص توہم پرستی پر مبنی الل ٹپ تشریح پر اتر آئے تو یہ بچوں کا کھیل بن جائے گا۔ چنانچہ انہیں حروف کی تشریح یوں بھی ہوسکتی ہے کہ:

ک سے کوہ	یعنی کوہ ہمالیہ	یا	ک سے کوفہ	یعنی اہل کوفہ حضرت
ہ سے ہمالیہ	کے تمام علاقوں		ہ سے ہلاکت	عثمانؓ پر یورش
ی سے یو کے (U.K)	پر یو کے والوں کا		ی سے یورش	کریں گے اور صبر کے
ع سے عروج	عروج صادق		ع سے عثمان	اس مثالی نمونے کو ہلاک
ص سے صادق	آئے گا۔		ص سے صبر	(شہید) کردیں گے۔

وغیرہ وغیرہ۔

یہ قرآن فہمی نہیں، قرآن دشمنی ہے کہ اللہ کی کتاب کا اس طرح مذاق اڑایا جائے۔ ہاشم رضا صاحب جیسے دانشوروں سے دردمندانہ گذارش ہے کہ دین کو بے عقلی کا مجموعہ بنانے کا کام اور ایسی گھٹیا تاویلات، مضحکہ انگیز نکتہ تراشی واعظوں کے لیے چھوڑ دیں، جس کے فہم کا رو سے مذہب کا عقل سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ پھر ان میں اور دانشور صاحبان میں کیا فرق ہوا؟

مطبوعات

جوئے تشنہ | جناب محمد ابن الحسن سید۔ اہتمامِ طباعت: قوس کمیونی کیشنز میاں چیمبرز، ٹمپل روڈ، لاہور۔ طباعتی معیار، جلد، سرورق بہت خوب! قیمت: نامعلوم

عمر ممکنہ فوج کے ساتھ گزاری، کام حسابات کا کیا ـــــ اب کوئی تصور کر سکتا ہے کہ یہ شخص اتنا زوردار ادیب و شاعر ہوگا کہ دوسری ایسی مثال نہ ملے گی۔ سید صاحب کی شخصیت کا دھندلا سا تصور میرے ذہن میں پہلے بھی تھا، مگر اب ان کی کتابیں پڑھ کر (اگر ان کے ساتھ مؤلف کی تصویر نہ بھی ہوتی) میں اس قابل ہوں کہ اُن کی شخصیت اور چہرے کا ایک خاکہ دل میں تیار کر سکوں۔ جناب ابن الحسن سید کی آواز معاشرے کے سازِ فن کے تمام تاروں کی آوازوں سے الگ پہچانی جا سکتی ہے۔

دل گھٹ کے رہ جاتا ہے، جب دیکھتا ہوں کہ میں ترجمان القرآن میں کوئی تفصیلی تبصرہ نہیں کر سکتا، بلکہ ایک ایک سطر کی جگہ بچانی پڑتی ہے۔ بس میرے خیال میں یہ کافی ہے کہ مؤلف کو اس کے فن کے چند جواہر ریزوں کے ذریعے متعارف کرا دیا جائے۔ پہلے یہ نثری شعر ملاحظہ ہو:

> "شاعری اصل میں شکر کا مقام ہے اور شکر قدر و قیمت کی پہچان کو کہتے ہیں۔ اپنی زندگی، کائنات اور خالقِ کائنات کی قدر دانی اور زبانِ حال سے شکر ادا کرنا ہی حیات کا حاصل ہے (ص ۱۱) ۔ دوسرا جملہ، "کبھی کبھی میں یہ سوچتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ نے آدمی کو شاید اس لیے پیدا کیا ہے کہ وہ تمام کائنات کے دکھ محسوس کرے"۔ (ص ۔ ۲۲)

چند اشعار:-

نہر پہ سایہ دار شجر کے جال سے موجیں اُلجھی ہیں
کوئی محسن، اِس اُلجھاوے کو جانے، ذرا سُلجھا آئے

دو گھڑی پاس رہو، حال نہ پوچھو میرا
درد احساس ہی احساس ہے، آواز نہیں

محبت کا بھوکا ہے سارا زمانہ
محبت بھری آنکھ سے مُسکراؤ

آج کل آدمی کا مسلک
زندگی کی صریح عریانی

جتنی آنکھیں ہیں اتنے نظارے
جتنے نظارے، اتنی حیرانی

کوئی آہٹ ہے رگِ جاں کے قریب
تیرے ہونے کا گماں ہوتا ہے

ہم نے دِل اُس کو ہی جانا ہے محسن
ہر گھڑی درد جہاں ہوتا ہے

اپنا چہرہ ہو، ہر اک تصویر میں
فن یہی ہے اور یہی معراجِ فن

پھول اُگ سکتا ہے صحرا میں مگر
چاہیے اس کے لیے دیوانہ پن

ایک بزرگ ادیب و شاعر کے بارے میں اپنی طرف سے کچھ زیادہ کہتے میں جھجک بھی تو ہوتی ہے

شمع اور دریچہ | جناب محمد ابن الحسن سیّد - ناشر: ادارۂ علم وفن پاکستان، پشاور - ملنے کا پتہ: مکتبہ راول رویل راولپنڈی - طباعتی معیار، جلد اور سرورق خوشنما!
قیمت: ۳۵/- روپے

ایک مسافر جو بھاگلپور سے پٹنہ گیا - وہاں سے ڈھاکہ پہنچا، پھر اسلام آباد کی طرف بڑھا - وہ اسلام آباد سے اکتوبر ۸۲ء کو تخیل کی ایک ٹائم مشین تیار کر کے سفرِ امریکہ پہ روانہ ہوگیا - یہ کتاب اسی سفر کا حصہ ہے، مگر مروّجہ سفرناموں کی لکیروں کی فقیری سے اجتناب کرتے ہوئے ابن الحسن سیّد نے ذرا مختلف انداز اختیار کیا ہے - میں سنجیدگی و پاکیزہ گفتاری کے ساتھ ہلکے پھلکے دل خوش کن مزاج کا لطیف امتزاج دیکھ کر حیران ہوں - پھر اس نگارش میں ایک جذبہ، ایک شعور، ایک مقصد گردش کر رہا بسا ہے - اپنی مقصدیت کا خلاصہ

بالفاظِ مؤلف یہ ہے کہ "عصرِ حاضر پر رواں تبصرہ" — اور اس تحریر کی شان میں ڈاکٹر وحید قریشی نے کیا خوب کہا کہ "آج کہ ہمارے یہاں بھدی اور بنجر نثر لکھنے کا رواج عام ہو رہا ہے، محمد ابن الحسن سید نے خوب صورت اور نوک پلک سے درست نثر نگاری کی داغ بیل ڈال دی ہے"۔ (فلیپ اوّل)

اب جناب مؤلف کے چند جملے:

"ماضی جس کے بغیر کوئی آئندہ نہیں، جہاں لوٹنا تو ممکن نہیں لیکن جس کی بازخوانی اس لیے بھی ضروری ہوتی ہے کہ مستقبل میں آرزومندی کے ساتھ آگے بڑھ سکیں"۔ (ص-۱۰)

"اپنی تاریخ پر اصرار اس بات پر اصرار ہے کہ دوسروں کے ساتھ ہمیں بھی اپنے تعصبات کے ساتھ پُرامن ماحول میں زندہ رہنے کا حق حاصل ہے"۔ (ص-۱۳)

"کسی نے پھول کو توڑنا بھی چاہا تو اس طرح کہ اوس چھلکے نہیں، پھول بکھرے نہیں"۔ (ص-۱۷)

"جہاں بھی گئے (مُراد ہے ہمارے اسلاف - ن-ص) انھوں نے اپنی تہذیب کی بنیاد گہری اور کرسی اونچی رکھی اور اُس کرسی پر صدیوں کے پسے ہوئے انسانوں کو لا بٹھایا"۔ (ص-۴۸)

"اب تو بس اتنا ہی چاہیے کہ انسانی اعضا کے زیادہ سے زیادہ فاضل پرزے مہیا ہوں تاکہ اس کی طبیعی عمر کو امکانی حد تک طول دیا جا سکے، اور اس کی پیداواری اور صرفی صلاحیت میں اضافہ ہو- اس ماحول میں شاعری کی گنجائش کیا رہ جاتی ہے۔ کچھ ہو بھی تو شاید کمپیوٹر میں الفاظ ڈھالے جا سکتے ہیں"۔ (ص-۸۵)

اب ان چند جملوں سے ایک ہلکی سی جھلک دکھلانے کے یہ معنی تو نہیں کہ سفرنامہ کا اجمالی سا بھی تصور دلایا جا سکے، جو جو دلچسپ عنوان اور تمثیلیں اور استعارات، نیز ٹکراتے ہوئے نظریات اور تہذیبوں کے جو مسائل جناب ابن الحسن سید نے بیان کیے ہیں اور جن بہت سی شخصیتوں اور ان کے افکار کا تعارف کرایا ہے، وہ ساری چیزیں کیسے یہاں نمایاں ہو جائیں۔ سید صاحب تو یہ

بتلاتے ہیں کہ گویا اپنے یہاں بہت سی جانی۔ انجانی ٹیمیں گھس آئی ہیں، کچھ معلوم نہیں کہ کس کا ساتھ دینے میں ہماری جیت ہے اور کس کے ساتھ ہار۔ سید صاحب کہتے ہیں کہ میں تو بس "رواں تبصرہ گو" ہوں۔

تو بس اسی پر ہمارا "رواں تبصرہ" ختم، آپ کتاب کا خود مطالعہ کر کے مدعا کو سمجھیے۔

بچوں کی حسناتی کہانیاں از جناب طالب الہاشمی - ناشر: حسنات اکیڈمی - ۱۹- سی منصورہ، لاہور ۱۸

ادارہ الحسنات کی طرف سے پہلے بھی بچوں کے لیے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت، آپؐ کے مشن اور آدابِ زندگی اور دعاؤں وغیرہ کا خلاصہ شائع ہو چکا ہے۔ علاوہ ازیں حسنات اکیڈمی کی طرف سے بچوں کے لیے کہانیوں کے سلسلے میں پہلی پیش کش "کوہ قاف کے مجاہد" تھی، جس میں روسیوں کے خلاف امام شامل شہید کی معرکہ آرائیوں کا نقشہ پیش کیا گیا تھا۔

اب کہانیوں کا ایک نیا سیٹ شائع ہوا ہے۔ اس سیٹ میں شامل ہیں: - ۱ - بدر کا شہسوار اور دوسری کہانیاں۔ ۲ - بادشاہی میں فقیری اور دوسری کہانیاں۔ ۳ - غریب بادشاہ اور دوسری کہانیاں۔ ۴ - کرخ کا درویش اور دوسری کہانیاں۔ ۵ - شیر دل سلطان اور دوسری کہانیاں۔ ۶ - دلوں پر حکومت اور دوسری کہانیاں۔

ان پمفلٹوں کو بچوں کی آسان زبان اور کہانیوں کے پیرائے میں پڑھ کر میرا یہ نقطہ نظر تازہ ہو گیا کہ تاریخِ انسانی کے پاس اچھی اور بُری ہر قسم کی شخصیتیں اور دل نوش کن، سنجیدہ اور سبق آموز رنگا رنگ ایسے واقعات موجود ہیں جو واقعاتی اسٹیج پہ بہترین کہانی کے روپ میں سامنے آتے ہیں، بشرطیکہ کوئی ذی شعور ادیب ان کا عکس لفظوں میں تیار کر سکے۔ اس لحاظ سے جناب طالب ہاشمی نے بڑی کاوش و محنت سے کام لیا ہے۔ ایک طرف صحابہ کرام کی سیرتوں کو سامنے رکھا ہے، دوسری طرف تابعین اور تبع تابعین میں سے اللہ کے خاص بندوں کی زندگیوں سے استفادہ کیا ہے۔ اور تیسری طرف بادشاہوں یا سپہ سالاروں

یا لیڈروں کے حالات نگاہ میں رکھے ہیں۔ اور پھر کئی منتخب تاریخی تصویروں کو پیش کر دیا ہے۔

ابھی اس دائرے سے باہر وسیع تر میدانِ کار موجود ہے، جس پر زیادہ تر سیکولر ذہنیت کا قبضہ ہے اور ان کے اختیار کردہ موضوعات اور قصوں کے ذریعے خدا پرستانہ ذہن کے اہلِ قلم نے بچوں کے ذہنوں و کردار کی تعمیر کے لیے کچھ زیادہ تجربات نہیں کیے گئے ہیں۔ محبانِ دین بالعموم یہ سمجھتے ہیں کہ قرآن و حدیث یا صحابہ کرام اور دوسری نیک ہستیوں کے علاوہ کوئی موضوع نہیں ہے اور یا پھر زیادہ سے زیادہ اپنی تاریخ کی اچھی اچھی جھلکیاں دکھا کر کام کیا جا سکتا ہے۔ میرا مشورہ ہے کہ کچھ نئے لوگ اس خود عاید کردہ حدبندیوں کو توڑ کر آگے نکلیں اور علمِ کائنات، سائنسی ایجادات، سائنسی فکشن، احوالِ بر و بحر کے مطالعے کو موضوع بنائیں اور ان سارے راستوں سے خدا پرستی اور راستی اور نیکی کا کام ابھاریں۔

اقلیم | مجموعہ کلام (دیوان) جناب جعفر بلوچ۔ ناشر: مکتبہ عالیہ، اردو بازار، لاہور۔
طباعتی معیار بہت اچھا۔ قیمت: -/۳۰ روپے۔

اس نوجوان شاعر سے میرے دیرینہ مراسم ہیں۔ جعفر ہمیشہ بہت محبت و احترام سے ملتا رہا۔ لیکن میں دیکھتا ہوں کہ فن میں پیش رَوی کے لحاظ سے وہ میرے لیے بزرگ ہوتا جا رہا ہے اور میرے دل میں اس کے لیے احترام میں مسلسل اضافہ ہو رہا ہے۔ جعفر کو گردشِ ایام نے بہت چکر دیئے، یہاں تک کہ آخری گھاؤ میں وہ اسے کالج کے استاد کی کرسی پر بٹھا گئی۔ مگر اسے دیکھیں تو یہ فقیر عظمت مآب نہ تو استاد نظر آتا ہے، نہ کرسی والا، نہ شاعر، بلکہ ایک خاموش اور حیرت زدہ سا نوجوان جو یہ سوچ رہا ہو کہ وہ کیا ہے اور کہاں آ گیا ہے۔ پھر اس کی خاموشی کی جھیل میں سے کوئی مزاحیہ جملہ بلبلہ بن کر ابھرے گا یا اچانک فی البدیہہ کسی شخص یا واقعہ کے متعلق پھڑکتا ہوا ایک شعر نمودار ہو جائے گا۔ تب آپ غور سے دیکھیں گے کہ یہ کیا اسرار ہے۔ میرا خیال ہے کہ اس کے پاس کوئی خود ساختہ کمپیوٹر ہے، جس پر موضوع، بحر، معیارِ زبان، تراکیب و استعارات، قافیہ و ردیف، تخیل کا انداز وغیرہ کے بٹن دبا دیتا ہے اور تیزی سے

مطلوبہ شعر یا غزل یا نظم نمودار ہو کر محفل کے لیے حیرت افزا بن جاتی ہے۔ یا پھر اس نے طرز پر سوچیں تو ہو سکتا ہے کہ کوئی جن اُس کے قابو میں ہو اور طرفۃ العین میں دیوان بھی تیار کر سکتا ہو۔ خیر اب دو چار شعر (کسی انتخابی کاوش کے بغیر) پیش کیے جاتے ہیں تاکہ آپ کو اندازہ ہو کہ جعفر کی شاعری مذاق نہیں ہے:

کہا شعور نے اُس وقت حرفِ قُم مجھ سے
کہ لاشعور جگانے سے جاگتا بھی نہ تھا

کیا ہے اس آیتِ افلاسِ بشر کی تاویل؟
دل کے ارشاد پہ ذہنوں کی گواہی نہ رہی

تفسیر ہو کیا خاک مرے خطِ جبیں کی
شارح بھی ہے کم فہم، نوشتہ بھی اَدق ہے

تا حشر فراموشِ زمانہ نہیں ہوں گے
وہ لوگ جنہیں یادِ محبت کا سبق ہے

جب اُٹھیں گُل کی دریدہ دامنی پر انگلیاں
ہو گئی پاگل وفورِ غم سے خوشبو اور بھی

یاد ہم ڈوبنے والوں کی تجھے آئے گی
جب ترے حسن کا چڑھتا ہوا دریا اترا

سحر کو راہ دکھانے کا کیا صلہ ہو گا
یہ سوچتے ہی ستاروں کی آنکھ بھر آئی

مطلعِ فاراں | نعتیہ مجموعہ جناب حافظ لدھیانوی۔ ملنے کا پتہ: بیت الادب، ۳۴ جی راجہ روڈ، گلستان کالونی، فیصل آباد۔ تقسیم فی سبیل اللہ۔

اگر ہم عصر نعت نگاروں کو اشعار کی شکل دے کر ایک قصیدہ میں ڈھالا جائے تو اس کے مطلع کا ایک مصرع حافظ لدھیانوی ہوں گے اور دوسرا حفیظ تائب۔

میں نے حافظ صاحب کی شخصیت جس طرح منور پائی ہے مجھے اندیشہ ہوتا ہے کہ حضورؐ کے بارے میں اُن کے حقیقی جذبات و تاثرات کو الفاظ اور مصرعے اُٹھا نہیں سکتے۔ پھر بھی:

ع ہے میرا کام پیغامِ رسولِ ہاشمی لکھنا۔

بس بطور تبرک دو تین شعر ؎

اُٹھی جو نگاہ سوئے روضہ
اشکوں میں وجود ڈھل گیا ہے

نظروں میں ہے گلستانِ طیبہ
خوشبو سے بدن مہک اٹھا ہے

دلِ خرابہ ہے، جس میں نہیں ہے یادِ نبیؐ — وہ زیست کیا ہے جسے عشقِ مصطفےٰؐ نہ ملا
ہر اک زباں پہ ہیں چرچے رسولِ رحمت کے — خدا کا شکر، مجھے نعت کا زمانہ ملا

تقدیمی اور تقریظی صفحات مرزا منور اور حفیظ تائب کے قلم سے۔ فلیپوں پہ اعاظم و اکابر کی آراء۔

ہامان کے قرآنی اذکار | از سید شیر محمد لاہور۔ پتہ: ۵۶، اِی وَن۔ گلبرگ نمبر ۳۔ لاہور

یوں تو یہ ۱۶ صفحے کا ایک پمفلٹ ہے، مگر نہایت معرکہ آرا تحقیقی بحث ہے۔ جو مستشرقین کی طرف سے ہامان کے سلسلے میں قرآن پر اعتراضات کے جواب میں پیش کی گئی ہے۔ ۲۲ کتابوں سے استفادہ کیا گیا ہے۔ عنوان مناسب نہیں معلوم ہوتا۔ "ہامان کا ذکر قرآن میں" وغیرہ طرز کے الفاظ کافی تھے۔ یہ مقالہ کئی دوسری جگہوں کے علاوہ ترجمان القرآن میں بھی شائع ہو چکا ہے۔ اور اب اس پمفلٹ میں مؤلف جو ترمیم و اضافہ کرنا چاہتے ہیں اس کے بعد یہ تحقیق مزید مفید بن جائے گی۔

حادثۂ کربلا | از مولانا ابوالحسین محمد عظیم الدین خطیب۔ ناشر: ادارہ تعلیم و تصنیف، سلیم آباد، خیرپور میرس، سندھ۔

مسلمانوں کی بہت سی چپقلشوں کا باعث پرانے تاریخی واقعات کی مختلف تعبیرات ہیں۔ حادثۂ کربلا کے متعلق خصوصاً پہلے تو کچھ غلو کی باتیں شیعہ بھائیوں کی طرف سے ہوتی تھیں۔ پھر محمود عباسی صاحب نے دوسرے رُخ سے واقعہ کی پوری تصویر بدل کے دکھا دی۔ پیشِ نظر پمفلٹ پر بھی اس کا اثر ہے۔ لکھا ہے: "آخرکار حضرت حسینؓ نے فیصلہ کر لیا کہ کوفہ جانے کے بجائے دمشق جا کر خلیفہ یزید کے ہاتھ پر بیعت کر لینا ہی مناسب ہے"...... "فریب خوردگی یا اجتہادی سوچ کی بنیاد پر اختیار کیے ہوئے موقف سے یہ دست برداری ...... (ص۔ ۱۰)۔ پمفلٹ بتاتا ہے کہ "امام حسینؓ یزیدی فوج کی زد میں نہیں آئے تھے بلکہ ساٹھ تجربہ کار جنگجو کوفیوں نے اچانک سیدنا امام حسینؓ کے خیمہ پہ دھاوا بول دیا"..... "امیر عمرو بن سعد۔

شمر ذی الجوشن اور حر بن یزید اپنے دستے کے افراد کو ساتھ لے کر حضرت حسینؓ کے قافلہ کی جانب دوڑے تاکہ..... حضرت حسینؓ اور آپ کے اہلِ خاندان کی مدد کریں۔" (ص - ۱۲)

اس مبحث کے نتیجے میں پیدا کردہ نکتہ یہ ہے کہ" اس اندوہناک حادثہ کو مدتوں بعد اسلام و کفر کی جنگ اور فسق و فجور کے خلاف عظیم ترین جہاد کا رنگ دے کر کسی بھی قائم شدہ نظامِ حکومت کے خلاف خروج کے لیے استعمال کیا جانے لگا۔" (ص - ۱۳) گویا حضرت خطیب صاحب کا مقصد یہ ہے کہ کفر و استبداد پر قائم ہونے والی یا فسق و فجور پھیلانے والی حکومتوں کے بارے میں مسلمان آرام سے رہیں، ان سے کوئی تعرض نہ کریں۔ اس سلسلے میں اگر تاریخ سے کوئی نظیر آیات و احادیث کی مطابقت میں ملتی ہو تو اسے ہرگز ہرگز استعمال نہ کریں۔

حضرتِ والا! صدیوں پہلے کی تاریخ کے بارے میں آپ اپنے سامعین یا مصروف قارئین کو جو نقشہ چاہیں دکھا سکتے ہیں، مگر تاریخ کو اپنے رنگ میں رنگنے سے تاریخ نہیں بدلتی۔ یزید کی غیر اسلامی عجمیت زدہ حکومت (جو خلافت علیٰ منہاجِ نبوت بہرحال نہ تھی) کسی بھی طرح تقدس کا مقام نہیں پا سکتی۔ اور نہ امام حسینؓ کا درجہ آپ جیسے حضرات کی علمیت پست کر سکتی ہے۔ بہتر ہے کہ قدیم تاریخی واقعات سے زیادہ اہم آپ احکامِ کتاب و سنت کو قرار دیں اور اعتقادات کے ساتھ ساتھ اخلاقیات، سیاسیات اور معاشیات کے اسباق بھی لوگوں تک پہنچائیں۔ جھگڑوں، بحثوں والے موضوعات سے زیادہ اہم اور زیادہ تعداد میں متفق علیہ اوامر و نواہی ہیں۔ اُن کو وعظوں اور تحریروں میں بیان فرمائیں۔

سیاحت نامہ | از جناب ماہر القادری مرحوم۔ مرتبہ: جناب طالب ہاشمی۔ ناشر: حسنات اکیڈمی - ۱۹ - سی منصورہ - لاہور ۱۸ - اچھی طباعت، مضبوط جلد، خوبصورت سرورق کے ساتھ ۳۰۴ صفحے کی کتاب کی قیمت ۴۰/- روپے

ہمارے مرحوم بھائی ماہر القادری کی زندگی کا بڑا حصہ سفر میں گذرا۔ مشاعروں کے لیے بہت سے سفر۔ اور پھر یہ افریقہ، یورپ، مشرقِ وسطیٰ اور حجاز کے لمبے لمبے سفر، تاآنکہ

ارضی زندگی کا سفر ختم ہو گیا۔

اس شاندار معلوماتی اور ادبی کتاب کو پڑھتے ہوئے میں نے جو اشارات شروع کے خالی صفحات میں لکھے ہیں اگر ان کی طرف ذرا بھی دھیان دوں تو کم از کم چار صفحے کا نوٹ لکھنا شاید کفایت کر سکے۔ ماہر صاحب بہت بڑے شاعر و ادیب، بہت شریف انسان، بڑے محبت کیش دوست اور فطرت اور انسان دونوں کی تجلیات کو دل و نگاہ سے اخذ کر کے دوسروں تک پہنچانے والے خدا پرست تھے۔ ایسے آدمی کی تحریر کوئی معمولی چیز نہیں۔ کتنے ہی تو لفظ اور جملے میں نے منتخب کیے۔ مختصر یہ کہ وہ جہاں گئے، مناظر فطرت کو خوب دیکھا، تاریخی اور تمدنی معلومات حاصل کیں۔ عجائب سے استفادہ کیا، رنگا رنگ کھانوں سے نہ صرف دل کھول کر لطف اندوز ہوئے، بلکہ لفظوں کے دسترخوان بچھا کر عجیب و غریب ماکولات و مشروبات کو ان پہ جمع کر کے دکھایا، طرح طرح کی شخصیتوں کی تجلیات دیکھیں، ہر جگہ کی دینی سرگرمیوں اور دینی مراکز، دینی انجمنوں اور مسجدوں پہ خاص توجہ دی۔ اسی کے ساتھ اردو زبان اور شعر و شاعری کے بارے میں ان کی دلچسپیاں افراد اور مجالس پہ مرکوز ہوتی رہیں۔ اور خاص خاص شہروں کے متعلق بہت تفصیل سے ادبی مصوری کی ہے۔ آدمی ان کے سفرنامے کو پڑھتے ہوئے خود کو بھی حالتِ سفر میں محسوس کرتا ہے۔

چند دلچسپ باتیں: ماہر صاحب نے لکھا ہے کہ سانپوں کی ڈھائی ہزار قسمیں ہیں (ص-۵۷) ڈاکٹر حمید اللہ صاحب کے گھر کی سیڑھیاں ۱۱۲ ہیں (ص ۱۲۰)۔ پیرس کے مرکزی چوک سے ۶ اسٹرکیں نکلتی ہیں (ص - ۱۲۱)۔ ایفل ٹاور دو فرلانگ اونچا ہے۔ (ص - ۱۲۱)

ایک مختصر تاثر میں ضرور بیان کرنا چاہتا ہوں، جو اس کتاب کو پڑھتے ہوئے پیدا ہوا کہ مرحوم ماہر القادری نے شرافت و پاکیزگی کی حدود میں زندگی کا رس خوب اچھی طرح نچوڑا، پیا اور پلایا۔

ایک جگہ ماہر صاحب نے لکھا ہے ازار بند ڈھلنے "اکڑا لی" کیا۔ "ازار" ہی کافی نہ تھا؟

طالب ہاشمی کا بڑا احسان ہے کہ انہوں نے ماہر القادری کی شخصیت کے نہایت دلچسپ مرقعے کو ہم تک پہنچایا۔

دینی مدارس کی روایات اور نصاب کی خصوصیات | جناب پروفیسر سید محمد سلیم

ناشر: ادارہ تعلیمی تحقیق - ۸- اے ذیلدار پارک، اچھرہ، لاہور - طباعتی معیار بہت اچھا -
قیمت: ۹/- روپے

۶۶ صفحے کی اس کتاب میں اتنی معلومات ہیں کہ ان کا سرسری سا تعارف کرانا بھی مشکل - دورِ نبوت میں دینی تعلیم کا اہتمام اور اس کی توسیع کا اجمالی ذکر کرنے کے بعد پہلی دوسری صدی ہجری کی تعلیمی و نصابی پیشرفت کا بیان، پھر چوتھی صدی ہجری (معتزلہ، فلاسفہ اور قرامطہ کے عروج کا دور) کی تفصیل - دورِ بنو امیہ میں خارجیوں کے فتنے کے اثرات تعلیمِ عقائد پر - سقوطِ بغداد کے بعد تاتاری دور میں نصابِ جدید میں علومِ دینی و عقلی کا اضافہ - پھر برصغیر میں کمپنی کی حکومت کے دور سے لے کر مغلوں کے عہد تک، نیز ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے بعد علی گڑھ اور دیوبند کی دو تعلیمی اسکیموں پر کام کا آغاز - فارسی نصاب کا خصوصی ذکر - اصولِ تدریس اور کتبِ تدریس کا بیان - مغربی علوم کی آمد - انگریزی حکومت کی اسلام دشمن روش - ان مباحث سے نکل کر دینی نصاب کی تمام کتابوں کا انڈکس اور ساتھ ہی ہر مضمون کے لیے جماعت وار تقسیمِ اوقات اور مقدارِ درس -

تعلیم اور خصوصاً دینی تعلیم سے تعلق رکھنے والے یا اس سلسلے میں مطالعہ و تحقیق کرنے والے حضرات ضرور پڑھیں -

---

سورۂ فاتحہ ــ نظامِ تعلیم کی اساس | جناب پروفیسر سید محمد سلیم - ناشر: ادارہ تعلیمی تحقیق تنظیم اساتذہ، پاکستان - ۸- اے ذیلدار پارک، اچھرہ - لاہور - قیمت: ۳/۵۰ روپے

سورۂ فاتحہ اسلامی تعلیم و ہدایت کا چونکہ ایک خلاصہ ہے - اور اشارۃً اس میں ضروریاتِ دین بیان ہوگئی ہیں - اس لیے اس کی ہدایت سے سید صاحب نے بجا طور پر تعلیم و تدریس کے لیے رہنمائی اخذ کی ہے - اس پمفلٹ سے ان کا فہمِ قرآن اور ان کے ذوقِ تعلیم کی ژرف نگاہی سامنے آتی ہے -

---

رسالہ دانش مندی تصنیف: شاہ ولی اللہ دہلوی - ترجمہ: مولانا سید ظہیر الدین احمد - مقدمہ و تعلیقات از پروفیسر سید محمد سلیم - ناشر: ادارہ تعلیمی تحقیق، تنظیم اساتذہ پاکستان - ۸ - اے ذیلدار پارک، اچھرہ، لاہور - قیمت: ۴۰/- روپے -

یہ رسالہ دراصل اسلامی تعلیم کے سلسلے میں طریقِ تدریس کی رہنمائی کرتا ہے - شاہ صاحب جس دورِ انحطاط میں پیدا ہوئے اور جو تفرقہ اور بدعتیں اور جہالتیں انہوں نے دیکھیں، ان کی وجہ سے جوشِ تجدید ان کے اندر پیدا ہوا - اس کو بنائے گفتگو بنا کر یہ واضح کیا گیا ہے کہ شاہ صاحب تعلیم کے شعبہ میں کیا تبدیلی چاہتے تھے - انہوں نے ایک مختصر اور آسان نصابِ تعلیم تجویز کیا - پھر اصلی زور طریقِ تدریس پر ہے، اور طریقہ ہائے تدریس کی ایسی اقسام بیان کی ہیں کہ چشمِ بصیرت ممنونِ احسان ہو کر رہ جاتی ہے - تدریسی یا نصابی کتابوں کے لکھنے کے لیے بھی کچھ اصول اس رسالے میں ملیں گے -

---

ہمقدم ڈائری ۱۹۸۷ء پیش کش: ادارہ مطبوعاتِ طلبہ - نمبرا، ذیلدار پارک، اچھرہ، لاہور

نوجوانوں کی مرتب کردہ اس ڈائری کی متعدد رنگوں میں بڑی خوشنما ڈیزائننگ کی گئی ہے - شروع میں ضروری دُعائیں اور اذکار ہیں - اپنی اصلاح آپ کے عنوان سے تعبدی اور دعوتی سرگرمیوں اور اپنے مطالعہ کے متعلق خود احتسابی کے لیے ماہ بہ ماہ اندراجات کرنے کو چند صفحات خاص کر دیئے گئے ہیں - صفحات کے اوپر کسی آیت یا حدیث کا ترجمہ درج ہے - آخر میں پتوں اور ٹیلیفون نمبروں کے اندراجات کے لیے چند صفحے ہیں - شروع میں اسلامی جمعیت طلبہ کی سال بہ سال سرگرمیوں کا خلاصہ درج کیا گیا ہے، نیز جمعیتی شہداء کی فہرست کے علاوہ کچھ اور معلومات بھی دی گئی ہیں - جلد بہت اچھی اور اس پر سنہری چھپائی -

---

ماہنامہ: دائرے مدیر: حسنین کاظمی - شائع کردہ: ریڈرز پبلی کیشن، شاہین چیمبرز، ۴ کمرشل ایریا، بلاک ۷/۸ کے سی ایچ ایس کراچی - قیمت فی شمارہ: ۱۰/- روپے سالانہ ۱۱۰/- روپے

یہ خالص ادبی و تحقیقی رسالہ ہے جس کا پہلا شمارہ (جنوری ۱۹۸۷ء) ہمارے سامنے ہے - افسانے

میں دیومالا (حیات اللہ انصاری)۔ بستی ایک مطالعہ (ڈاکٹر عبدالسلام) کے علاوہ ڈاکٹر نیر مسعود، آفاق صدیقی، مشرف احمد (موضوع: شوکت صدیقی)، ڈاکٹر انصار زاہد (جوگندر پال ’دردلادوا‘) ڈاکٹر سید ابوالخیر کشفی کے علاوہ دو تین اور نثر پارے اور کچھ نظمیں اور غزلیں ہیں۔ پڑھنے کے لیے مجموعی طور پر اچھی سطح کا دلکش مواد ہے۔

ماہنامہ نیرنگِ خیال	ایڈیٹر: سلطان رشک۔ پتہ: ۸۔ پی ایم اے ہاؤس، لیاقت روڈ،

راولپنڈی۔ چندہ سالانہ مع خاص نمبر ۱۵۰/- روپے۔

حکیم یوسف حسن کا مقام صحیفہ نگاری کی تاریخ میں بہت اونچا مقام رکھتا ہے۔ نیرنگ خیال اسی مرحوم ہستی کا تاسیس کردہ رسالہ ہے۔ جسے اب سلطان رشک اپنے چند بزرگوں اور دوستوں کے تعاون سے بڑی خوبی سے مرتب کر رہے ہیں۔ اس وقت ہمارے سامنے ستمبر ۱۹۸۶ء کا خاص نمبر ہے۔ جس کی ضخامت ۲ سو صفحات اور قیمت ۴۰/- روپے ہے۔ تحقیقی، مزاحیہ، افسانوی اور منظوم حصوں سے میں خوب لطف اندوز ہوا، مگر ترجمان القرآن کے صفحات میں اب گنجائش نہیں ہے کہ تفصیل سے کچھ کہہ سکوں۔

مختصراً یہ کہ یہ ادبی رسائل میں ایک ممتاز مجلہ ہے۔

مجلہ: شعاع	مدیرہ: شگفتہ بانو۔ بہ اہتمام تنظیم اساتذہ پاکستان (خواتین)

پتہ: جمعیت الفلاح، اکبر روڈ، کراچی صدر۔ زرِ تعاون: ۱۰/- روپے

بڑی مسرت کی بات ہے کہ محبتِ اسلام خواتین اساتذہ کی تنظیم نے یہ مجلہ شروع کیا ہے اور اس کا جو شمارہ (۲) سامنے ہے، وہ اچھی اچھی نگارشات پر مشتمل ہے، جن کے لکھنے میں خواتین کا حصہ زیادہ ہے۔ سرورق رنگین ہے مگر سادہ۔ طباعتی معیار کو بہتر بنانے کی ضرورت ہے۔

قرار دادِ مقاصد کی بنیاد پر

جسٹس تنزیل الرحمٰن

کے

اہم عدالتی فیصلے

(جاری کردہ سندھ ہائی کورٹ)

جو پورے قانونی اور عدالتی نظام کے لیے اسلامی راستے کو واضح کرتے ہیں ۔

سائز $\frac{۲۳ \times ۱۸}{۸}$ قیمت :- ۲/۲۵ روپے

تبلیغی مقاصد کے لیے :- ۱۵۰/= روپے سینکڑہ